خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

دسمبر ۲۰۲۳ء

اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

عالمی یوم اردو کے موقع پر ۹ر نومبر ۲۰۲۳ء کو اردو اکادمی آڈیٹوریم میں علامہ اقبال اور اردو کے موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے پروفیسر عباس رضا نیر

مذکورہ جلسہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر ہری اوم (آئی۔اے۔ایس)

اترپردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد : ۵۲ دسمبر ۲۰۲۳ء شمارہ : ۶

ایڈیٹر : سکریٹری

معاون : محمد معاذ اختر احسن (سپرنٹنڈنٹ)

زر سالانہ : پچاس روپے 50/-
قیمت فی شمارہ : پانچ روپے 5/-

upurduakademi3@gmail.com
www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،
گومتی نگر، لکھنؤ-226010
فون نمبر:0522-4022924

سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
محمد حامد علی خاں کی فکشن تنقید	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۳
غزل	محمد مجاہد سید	۱۰
غزل	ڈاکٹر معصوم شرقی	۱۰
پروفیسر شارب ردولوی.....	ڈاکٹر الیاس عزیز	۱۱
غزل	بےنوا قادری	۱۶
غزل	عرفان زنگی پوری	۱۶
رباعی	محمد الیاس تائب	۱۷
غزل	احمد کمال حشمی	۲۲
غزل	معید رہبر	۲۲
ادیب سہارنپوری کم عمر کا...	ڈاکٹر محمد مستمر	۲۳
غزل	محمد فہد پاشا	۳۰
غزل	ڈاکٹر حشیم فاروقی	۳۰
مبارکباد	اشفاق برادر	۳۱
عالمی یوم اردو کا انعقاد (خبر)	ادارہ	۳۲

●●●

اداریہ

آج ہر شخص کے لیے انٹرنیٹ یا یوں کہوں کہ سوشل میڈیا لازم وملزوم بن چکا کیا ہے۔ بغیر اس کے استعمال کے زندگی دشوار کن ہوتی نظر آتی ہے۔ آج پوری دنیا کا گلوبلائزیشن ہو چکا ہے۔ اب چند سکنڈ میں آپ کا رابطہ دنیا کے کسی گوشے میں ہوسکتا ہے۔ سوشل میڈیا ایک ایسا پلیٹ فارم بن چکا ہے جس کے ذریعہ خیالات، تصورات اور مسائل کی شیئرنگ بہت آسان ہو چکی ہے۔

آج سوشل میڈیا اور دیگر برقی وسائل جیسے انٹرنیٹ، تعلیم وتدریس اور معلومات حاصل کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ بن چکا ہے۔

فیس بک، وہاٹس اپ، ای میل، ٹیلی گرام، مسینجر ، انسٹا گرام، یوٹیوب، ٹوئیٹر، بلاگ وغیرہ کے ذریعہ اردو زبان وادب سوشل میڈیا پر آ چکا ہے۔ اردو زبان وادب کی کئی ویب سائٹ بن چکی ہیں۔ ان سائٹوں پر ایک کلک کرنے سے ساری معلومات دستیاب ہو جاتی ہیں۔ گوگل انٹرنیٹ پر جانے کے بعد جس بھی موضوع پر مواد حاصل کرنا چاہیں، فوراً دستیاب ہو جاتا ہے۔

دنیا کے کئی ممالک میں اردو زبان وادب کی کئی سائٹیں موجود ہیں۔ اب ای۔ بک کے ذریعہ آپ پوری کتاب پڑھ سکتے ہیں۔ وہ کتابیں جو نایاب تھیں وہ اب کسی وقت بھی انٹرنیٹ کے ذریعہ پڑھ سکتے ہیں۔ اب تو بڑے بڑے مشاعرے اور سیمنار بھی زوم کے توسط سے منعقد ہو رہے ہیں۔ جس میں دنیا کے کسی گوشے میں رہنے والا شخص ان پروگراموں میں شرکت کر سکتا ہے۔

فیس بک پر سیاست کے علاوہ شعر وادب، موسم، ماحول اور زندگی کے پیچیدہ وتہہ دار پہلوؤں پر زیادہ مباحثے ہو رہے ہیں۔ فیس بک مڈل کلاس کے افراد کثرت کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ سیاسی، نظریاتی، علمی اور ادبی رجحانات ومحرکات یہیں سے جنم لیتے ہیں۔ دنیا کی عظیم واہم شخصیات ٹیوٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ بلاگ سب سے بہترین پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعہ آپ اپنے نظریات اپنے اسلوب کے ذریعہ پیش کر سکتے ہیں۔ اردو کے شائقین ابھی اس پر بہت کم توجہ دے رہے ہیں۔ اردو پورٹل آن لائن اخبارات ورسائل انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ فیس بک کے توسط ہی سے اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ ان سب کے ذریعہ وہ بلاخوف تردید اپنی باتیں کہہ رہے ہیں۔ نئے قلم کاروں کی ایک نئی کھیپ وجود میں آئی ہے۔ اب ان فوائد کے ساتھ ہی اردو کے مستقبل کے حوالے سے بعض خدشات بھی ظاہر کئے جا رہے ہیں۔

انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور سوشل میڈیا کی ہمہ جہت افادیت کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پلیٹ فارم کے توسط سے اردو زبان وادب کا مستقبل تابناک نظر آ رہا ہے۔

سکریٹری

ایڈیٹر

پروفیسر اسلم جمشید پوری
صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی،
میرٹھ-Mob.8279907070

محمد حامد علی خاں کی فکشن تنقید: ''اردو کے اٹھارہ ناول'' کے آئینے

فکشن تنقید کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی اور گوپی چند نارنگ سے قبل وقار عظیم، ممتاز شیریں، حسن عسکری وغیرہ کی تنقیدی کاوشیں ضرور نظر آتی ہیں۔ لیکن اردو داستان، ناول اور افسانے کی تنقید بہت زیادہ منظّم اور باقاعدگی کے ساتھ نہیں ملتی۔ یہ بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو فکشن تنقید کا یہ مربع، اس شعبے میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مربع نے 1960 سے 1990 تک کے تقریباً ۳۰ سال کے سفر میں اردو فکشن تنقید کو بے شمار نقد پارے عطا کیے ہیں۔ اردو فکشن تنقید میں اس نسل کے کچھ بعد ہی پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر شمس الحق عثمانی، مرزا حامد بیگ، پروفیسر انوار احمد، پروفیسر ارتضٰی کریم، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر اعجاز علی ارشد سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ پروفیسر حامد علی خاں تک پہنچتا ہے۔

پروفیسر محمد حامد علی خاں بطور محقق، ناقد، مترجم شہرت رکھتے ہیں۔ تحقیق و تنقید ان کا خاص میدان رہا ہے۔ ان کی کئی کتب ''گوپی چند نارنگ: حیات و خدمات''، ''صباح الدین عبدالرحمٰن''، ''عبدالغفور نساخ''، ''شاد کے بعد بہار کی شعری تثلیث: پرویز شاہدی، جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی''، ''جادۂ تفہیم''، ''اردو کے اٹھارہ ناول''، ''اصناف سخن و مشاہیر شعرائے فارسی''، ''مظفر پور: علمی ادبی اور ثقافتی مرکز'' کو ایوانِ ادب میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

جہاں تک فکشن تنقید میں حامد علی خاں کے کارناموں کا معاملہ ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے یوں تو فکشن تنقید پر بہت زیادہ نہیں لکھا، لیکن جو کچھ بھی لکھا سنجیدہ اور معیاری لکھا۔ ان کی کتاب ''اردو کے اٹھارہ ناول'' اردو ناول کی روایت، ماضی اور حال کو سمجھنے میں خاصی معاون ہے۔ اس کتاب کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو افسانے، افسانہ نگار اور ناول نگاروں پر متعدد مضامین سپرد قلم کیے ہیں، جو ہندو پاک کے معتبر رسائل میں شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض ان کے مضامین کے مجموعہ ''جادۂ تفہیم'' میں شامل ہیں۔

حامد علی خاں بنیادی طور پر سائنس کے طالب علم تھے۔ کلام حیدری سے ملاقات اور گفتگو کے بعد ادب کی طرف متوجہ ہوئے اور تنقید کو اظہار ذات کا وسیلہ بنایا۔ تنقید کے تعلق سے حامد علی خاں اپنا تجربہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''فن کاروں یا فن پاروں کی پرکھ کا سلیقہ مجھ میں جس حد تک بھی ہے ودیعت ایزدی ہے۔ تنقیدی شعور

ایک عطیہ الٰہی ہے جو کم وبیش تمام ذی ہوش وذی شعور کے اندر موجود ہوتا ہے۔ عام زندگی کے معاملات ومعمولات میں بھی یہی شعورِتنقید ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اسی کے اشتراک وتعاون سے اخذ وانتخاب کے مرحلے طے کئے جاتے ہیں ۔ پسند وناپسند میں خط تقسیم بھی شعور تنقید ہی کھینچتا ہے اور حسن وقبح، خیر وشر اور نیک وبد کا امتیاز بھی تنقیدی شعور ہی قائم کرتا ہے۔ گویا یہ ایسی قوت ہے جس کی کارفرمائی سے انسانی زندگی اپنا معیار متعین کرتی ہے۔‘‘

آگے مزید لکھتے ہیں:

’’گویا تنقید کی روشنی تخلیقی تجربات کو سنوارتی، سجاتی، نکھارتی اور اُجالتی بھی ہے۔ تنقید نہ ہو تو تخلیقی تجربات ممکن ہی نہیں۔ یعنی ادبی تجربات کی تراش وخراش اور تزئین وآرائش کی پشت، پر شاعر اور ادیب کی ناقدانہ بصیرت کا ہاتھ ہی ہوتا ہے۔‘‘

(حرف چند، پروفیسر محمد حامد علی خاں، جادۂ تفہیم، ص ۱۰، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۱۲ء)

درج بالا اشارات سے صاف ہے کہ حامد علی خاں کا تنقید کے تعلق سے اپنا نظریہ ہے۔ وہ تنقیدی شعور کو عطیہ الٰہی مانتے ہیں اور یہ شعور سب میں پایا جاتا ہے۔ ’’اردو کے اٹھارہ ناول‘‘ ان کی انفرادیت کو ثابت کرنے کو کافی ہے۔

’’اردو کے اٹھارہ ناول‘‘ کے انتخاب میں بھی محمد حامد علی خاں کے تنقیدی شعور کو دخل ہے۔ دراصل ۲۰۰۳ء میں معروف اسکالر اور ناقد اسلوب احمد انصاری کی کتاب ’’اردو کے پندرہ ناول‘‘ شائع ہوئی۔ اسی سے متاثر ہوکر آپ نے ’’اردو کے اٹھارہ ناول‘‘ تحریر کی۔ حامد علی خاں اپنی اس کتاب میں عذرا (صالحہ عابد حسین)، خدا کی بستی (شوکت صدیقی)، تلاش بہاراں (جمیلہ ہاشمی)، آنگن (خدیجہ مستور)، آبلہ پا (رضیہ فصیح احمد)، انقلاب (خواجہ احمد عباس)، آخر شب کے ہم سفر (قرۃ العین حیدر)، بستی (انتظار حسین)، فرات (حسین الحق)، گھروندا (حیات اللہ انصاری)، نادید (جوگندر پال) بارشِ سنگ (جیلانی بانو)، راجہ گدھ (بانو قدسیہ) دو گز زمین (عبدالصمد)، خلیج (سراج انور)، آئیڈنٹی کارڈ (صلاح الدین پرویز)، موجِ ہوا پیچاں (ساجدہ زیدی) فائر ایریا (الیاس احمد گدی) پر تجزیاتی تنقید کی ہے۔ محمد حامد علی خاں نے ناولوں کا انتخاب کرتے وقت اسلوب احمد انصاری کے انتخاب کو بھی پیش نظر رکھا ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ اسلوب احمد انصاری کی فہرست سے مختلف فہرست تیار کریں۔ اسلوب احمد انصاری نے اپنی کتاب ’’اردو کے پندرہ ناول‘‘ میں باغ وبہار (میر امن)، توبتہ النصوح (ڈپٹی نذیر احمد)، فردوس بریں (عبدالحلیم شرؔر)، امراؤ جان ادا (مرزا ہادی رسؔوا)، میدانِ عمل (منشی پریم چند)، ایسی بلندی ایسی پستی (عزیز احمد)، آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر)، اداس نسلیں (عبداللہ حسین)، آنگن (خدیجہ مستور)، آبلہ پا (رضیہ فصیح احمد)، ایوانِ غزل (جیلانی بانو)، راجہ گدھ (بانو قدسیہ)، کاروانِ وجود (نثار عزیز بٹ)، دشتِ سوس (جمیلہ ہاشمی)، آگے سمندر ہے (انتظار حسین) پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ دونوں کتابیں اردو ناول کے مطالعے کے لئے تقریباً ناگزیر ہیں۔ دونوں کتابوں کے تعلق سے اچھی خاصی گفتگو ہوسکتی ہے بلکہ دونوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ دونوں کے مطالعہ میں آنگن (خدیجہ مستور) آبلہ پا (رضیہ فصیح احمد) اور

راجہ گدھ (بانو قدسیہ) قدرِ مشترک ہیں۔ ساتھ ہی جمیلہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جیلانی بانو ایسے ناول نگار ہیں جو دونوں کے مطالعہ میں شامل ہیں لیکن دونوں نے ان کے مختلف ناولوں کو اپنے مطالعے کا محور بنایا ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے اپنی کتاب میں اردو ناول کی ابتداء انیسویں صدی اور پھر بیسویں صدی میں ناول کے بتدریج ارتقاء کے لحاظ سے ناولوں کا انتخاب کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اردو کا پہلا ناول ''باغ و بہار'' (خود ان کے مطابق) کو تسلیم کیا ہے بلکہ امراؤ جان ادا سے قبل کے تین ناولوں، باغ و بہار، توبتہ النصوح اور فردوس بریں کو خصوصیت کے ساتھ اپنی گفتگو میں شریک کیا ہے۔ پھر امراؤ جان ادا سے پریم چند (میدانِ عمل) اور پھر ترقی پسند ناول ایسی بلندی ایسی پستی، آنگن، اداس نسلیں اور پھر جدید ناول آگ کا دریا، راجہ گدھ، ایوانِ غزل، آبلہ پا اور پھر ۱۹۸۰ء کے بعد کے ناول کاروانِ وجود، دشت سوس اور آگے سمندر ہے، بالترتیب نثار عزیز بٹ، جمیلہ ہاشمی اور انتظار حسین تک اپنے مطالعے کو وسعت دی ہے۔ اس انتخاب کو ایک اچھا انتخاب کہا جا سکتا ہے لیکن ہر طرح سے مکمل اور نمائندہ انتخاب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسلوب احمد انصاری کے سامنے پندرہ ناولوں کو شامل کرنے کی کوئی مجبوری ہو۔ ورنہ وہ کئی اور اہم ناولوں کو بھی شامل کر سکتے تھے۔

پروفیسر محمد حامد علی خاں نے اپنے انتخاب میں اردو ناول کے آغاز و ارتقاء اور تاریخی سلسلے کو پیش نظر نہیں رکھا ہے اور ایسا انہوں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ انہیں کتاب لکھتے وقت یہ خوف ضرور رہا ہوگا کہ ان کی کتاب اسلوب احمد انصاری سے مماثل نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنے انتخاب کی شروعات عذرا، صالحہ عابد حسین سے کی۔ جس کا کوئی جواز، کسی اعتبار سے نہ تھا۔ نہ ہی اس ناول کی، ناول کی روایت میں کوئی خاص اہمیت۔ ایک بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ 'عذرا' میں Feminism کے گہرے نقوش ضرور دیکھے جا سکتے ہیں جو شاید ان سے قبل کسی اور ناول نگار کے یہاں اس طور نہیں ملے۔ محمد حامد علی خاں نے اسلوب احمد انصاری کی طرح ۲۱ صفحات کا پیش لفظ یا مقدمہ بھی تحریر نہیں کیا۔ اسلوب احمد انصاری نے نہ صرف اپنے انتخاب پر مفصل گفتگو کی ہے بلکہ ناول کی صنف اور ناول نگاری کے اجزا کے تعلق سے بھرپور بحث کی ہے۔ جبکہ محمد حامد علی خاں نے اپنے دو صفحے کے پیش لفظ میں نہ ناول نہ اپنے انتخاب پر کوئی گفتگو کی ہے۔ یہ ان کی انکساری اور عاجزی ہو سکتی ہے۔ لیکن مجھے معاف کریں، ہر جگہ عاجزی بہتر نہیں ہوتی۔ محمد حامد علی خاں کو نہ صرف اپنے انتساب پر ایک مفصل گفتگو کرنی چاہئے تھی بلکہ اسلوب احمد انصاری کے انتخاب و تجزیے پر بھی بات کرتے اور اپنے انتخاب و تجزیے کے جواز اور انفراد پر اظہار کرتے۔

اسلوب احمد انصاری نے جن ناولوں کا انتخاب اور تجزیہ کیا ہے ان پر بھی گفتگو کی ہے اور جن اہم ناولوں کو شامل نہیں کیا ہے ان پر بھی خاصی بحث کی ہے۔ ''باغ و بہار'' کو بندِ دل ثابت کیا ہے۔ یہی نہیں انہوں نے ہر منتخب شدہ ناول کا جواز پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی گئو دان (پریم چند)، ضدی (عصمت چغتائی)، شکست (کرشن چندر)، علی پور کا ایلی (ممتاز مفتی)، لہو کے پھول (حیات اللہ انصاری)، دو گز زمین (عبدالصمد)،

فائر ایریا (الیاس احمد گدی)، مٹی کے حرم (ساجدہ زیدی) کے شامل نہ کئے جانے کے لئے ناقدانہ حق پسندی سے کام لیتے ہوئے ان ناولوں پر اپنی دوٹوک رائے بھی دی ہے۔انہوں نے چار ناولٹ جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں (عزیز احمد)،ایک چادر میلی سی (راجندر سنگھ بیدی)، شب گزیدہ (عبدالستار)، نمبردار کا نیلا (سید محمد اشرف) کا ذکر خیر کرتے ہوئے انہیں اپنے دائرۂ کار سے الگ سمجھا اوران پر زیادہ گفتگو نہیں کی۔ہاں یہ ضرور ہے کہ انہوں نے نمبردار کا نیلا پر کئی سطریں قلم بند کیں۔ اس طرح اسلوب احمد انصاری کی کتاب کو ہم اردو ناول کے آغاز وارتقاء پر سیر حاصل کتاب کہہ سکتے ہیں۔

محمد حامد علی خاں کی کتاب ''اردو کے اٹھارہ ناول'' اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں محمد حامد علی خاں نے زیادہ تر ان ناولوں کا انتخاب اور تجزیہ کیا ہے جو ہماری یونیورسٹیز اور کالیجز میں نصاب کا حصہ ہیں۔یعنی محمد حامد علی خاں نے یہ کام طلبہ کی آسانی کے لئے کیا ہے۔یہی سبب ہے کہ انہوں نے کتاب کی زبان کو ثقیل نہیں ہونے دیا ہے۔پوری کتاب میں محمد حامد صاحب نے ناولوں کے تجزیے کہانی کے تسلسل کے ساتھ کئے ہیں۔وہ کہانی بیان کرتے جاتے ہیں اور آخر میں ناول پر مجموعی تاثر بیان فرماتے ہیں۔کہیں کہیں ناولوں کے اقتباسات بھی استعمال کرتے ہیں۔زیادہ تر ناولوں کا تجزیہ کرنے سے قبل وہ ناول نگار کا تعارف بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن کچھ ناولوں کے تجزیے کی شروعات مصنف کے تعارف کے بغیر ہو جاتی ہے۔یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ محمد حامد علی خاں نے لکیر کے فقیر کی طرح کسی ایک فارمولے کو نہیں اپنایا۔ ناولوں کی فہرست میں بھی نہ تو زمانی ترتیب ہے نہ ہی حروف تہجی کے اعتبار سے۔محمد حامد علی خاں صاحب کا تجزیہ کرنے کا بھی کوئی مقرر کردہ طریقہ یا فارمولہ نہیں ہے۔وہ کہانی کو بیان کرتے ہوئے ناول کا تجزیہ کرتے ہیں۔کہیں اپنی بات کی تصدیق کے لئے اقتباس پیش کرتے ہیں۔کہیں بغیر اقتباس کے بھی کام چلاتے ہیں۔کسی ناول نگار یا کسی اہم ناول سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے ہیں اسی سبب جہاں بھی انہیں کوئی کمی یا خامی نظر آتی ہے تو وہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

محمد حامد علی خاں نے اپنی کتاب میں عذرا (1944) سے فائر ایریا (1994) یعنی بیسویں صدی کے پچاس برسوں میں تحریر کردہ ناولوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔محمد حامد علی خاں نے ناولوں کا تجزیہ کرتے وقت طالب علموں کا خاص خیال رکھا ہے۔اس لئے سلیس زبان کا استعمال کیا ہے اور ناول کی پوری کہانی کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس سے طالب علموں کو جہاں ناولوں کا خلاصہ بھی مل گیا ہے اور یہ سلیقہ بھی کہ بڑے سے بڑے ناول کا خلاصہ کیسے تحریر کیا جاتا ہے۔ تلخیص کے ساتھ محمد حامد علی خاں نے ناول پر تنقید بھی کی ہے۔یہ بھی سچ ہے کہ ناقد نے طالب علموں کو بہت زیادہ تنقیدی فلسفوں اور اصطلاحوں میں نہیں پھنسایا ہے۔ان کے زیادہ تر تجزیے عام فہم ہیں۔ان کے مقابلے اسلوب احمد انصاری کے تجزیے زیادہ سنجیدہ، گہرے اور فلسفیانہ بحث پر مبنی ہیں۔جو بعض اوقات طالب علموں کے لئے مشکل ثابت ہوتے ہیں۔میں یہاں محمد حامد علی خاں کے تنقیدی رویوں اور طریقوں سے پُر چند اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ناول عذرا (صالحہ عابد حسین) کے مرکزی کردار کے تعلق سے محمد حامد علی خاں کا یہ بیان دیکھیں:

''عذرا ایک مثالی نسوانی کردار ہے جو نہ تو جنت کی حور ہے اور نہ کوہ قاف کی پری بلکہ ہندوستانی مٹّی کی سانولی سلونی عورت ہے جس کی پور پور میں ہندوستانی کلچر کی روح رچی بسی ہے۔ وہ سلیقہ شعار، وفا پرست اور ایثار وقربانی کا جاندار اور شاندار مجسمہ ہے۔ اس کے ارد گرد اور بہت سارے کردار ہیں جن کی اہمیت وافادیت مسلم ہے لیکن عذرا اپنے فکر وعمل کا وہ نمونہ ہے جس کی بنیاد پر ایک بہتر اور صحتمند معاشرے کی تشکیل کی توقع کی جاسکتی ہے۔'' (اردو کے اٹھارہ ناول/محمد حامد علی خاں، ص ۱۱، مطبوعہ ۲۰۰۸ء)

''آنگن'' ناول پر محمد حامد علی خاں کا یہ بیان ان کی ناقدانہ بصیرت کا غماز ہے:

''مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ خدیجہ مستور نے ''آنگن'' میں نفسیاتی حقیقت نگاری کا ایک جاندار نمونہ پیش کیا ہے اور بطور خاص نسوانی نفسیات کی گرہ کشائی میں کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم یہاں یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے مرد کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ اسرار میاں کا کردار نادر ہے جسے خدیجہ مستور نے نادر اسلوب میں نبھایا ہے۔ ماحول، کردار اور واقعات کی باہمی آویزش اور تربیت سے آنگن کے روپ میں انہوں نے ایک شاہکار خلق کیا ہے جسے اردو فکشن کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔''

(اردو کے اٹھارہ ناول/محمد حامد علی خاں، ص ۶۷، مطبوعہ ۲۰۰۸ء)

جوگندر پال کے ناول ''نادید'' کے متعلق لکھتے ہیں:

''جوگندر پال حالات کا غائر مشاہدہ کرنے کے عادی ہیں۔ واقعات وواردات اور معاملات ومسائل پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور انہیں سے موضوعات اخذ کرتے ہیں۔ وہ فن پارے کی پیش کش میں خارجی عناصر سے تحریک حاصل کرتے ہیں اور اسے داخلیت کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ اس طرح داخلی خارجی معنوی، صوری ہمکاری سے ان کا فن مرتب ہوتا ہے۔ وہ اپنا دل نکال کر کائنات کی بساط پر نہیں رکھتے بلکہ کائنات کی وسعت کو اپنے دل کے حدود میں سمیٹ لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کا فنی تجربہ داخلیت آمیز ہوجاتا ہے۔

(اردو کے اٹھارہ ناول/محمد حامد علی خاں، ص ۱۶۳، مطبوعہ ۲۰۰۸ء)

ساجدہ زیدی کے ناول ''موج ہوا پیچاں'' کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں:

''اس بیانیہ سے فکری ردعمل کے طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اُداسیوں اور مایوسیوں، محرومیوں اور زندگی کی بے رحم سفاکیوں کو بھی ساجدہ زیدی نے نئی معنویت کے پیکر میں ڈھالنے کی حسین وجمیل کاوشیں کی ہے۔''

(اردو کے اٹھارہ ناول/محمد حامد علی خاں، ص ۲۶۴، مطبوعہ ۲۰۰۸ء)

درج بالا اقتباس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر محمد حامد علی خاں نے تنقید کا حق ادا کردیا ہے۔ پہلے اقتباس میں انہوں نے ''عذرا'' کے کردار کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ قاری کو ''عذرا'' کے کردار کو سمجھنے میں نہ صرف آسانی ہوتی ہے بلکہ وہ بہت جلد عذرا کے اعمال وافعال اور رویوں کے بارے میں بھی سمجھ جاتا ہے۔

دوسرے اقتباس میں محمد حامد علی خاں صاحب نے ''آنگن'' میں خدیجہ مستور کی ناول نگاری پر مکمل اور جامع نوٹ لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے خدیجہ مستور کی نفسیات نگاری، کردار نگاری اور اسلوب کا بہترین جائزہ پیش کیا ہے۔

تیسرے اقتباس میں محمد حامد علی خاں نے جوگندر پال کے اسلوب کی پرتیں کھولی ہیں۔ ان کے جملوں میں خارجی عناصر کس طرح داخلیت کے رنگ میں رنگتے ہیں۔ پال صاحب کس طرح خارجی معاملات و واقعات کو اپنے اندر اتار کر، بلکہ ان واقعات و حادثات میں اتر کر انہیں داخلیت کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

آخری اقتباس میں محمد حامد علی خاں نے ساجدہ زیدی کے اسلوب کی کلید حاصل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اداسیوں، مایوسیوں، محرومیوں اور زندگی کی بے رحم سفا کیوں کو بھی ساجدہ زیدی نے نئی معنویت کا پیکر عطا کیا ہے۔ یہ کسی بھی فنکار کی ایسی خوبی ہے کہ اس تک آسانی سے پہنچا جا سکتا ہے۔

محمد حامد علی خاں کی تنقید نگاری میں اعتدال پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے تنقیدی رشحات میں کسی نظریے یا بات کو بنا تحقیق اور دلائل کے یکسر رد نہیں کرتے۔ پہلے اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں پھر نظریے کو تنقیدی شعور کی میزان پر رکھتے ہیں۔ بات صد فیصد غلط ثابت ہوتی ہے تو اس کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں۔ اور اگر بات میں کچھ فیصد لن ترانی ہوتی ہے تو حامد صاحب اس کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ محمد حامد علی خاں، شخصیت کے بت، تعمیر نہیں کرتے بلکہ تحقیق و تنقید کے اصولوں کی روشنی میں اپنی بات کہتے ہیں۔ مصلحت یا خوف و حرص و طمع بھی انہیں حق لکھنے سے باز نہیں رکھ پاتے ہیں۔

متعدد ناول اور ناول نگار ایسے ہیں، جن کے تعلق سے محمد حامد علی خاں نے حق گوئی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ جو کچھ پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ تنقیدی شعور سے ایماندارانہ انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا یہ طرز ہی ان کی شناخت ہے۔

دو ایک اقتباس ضرور ملاحظہ کریں:

راجہ گدھ (بانو قدسیہ) اردو کا ایک مشہور و معروف ناول ہے۔ محمد حامد علی خاں اپنے تجزیے میں لکھتے ہیں:

> ''اس ناول (راجہ گدھ) کے کئی علمی اور فکری پہلو ہیں جو تحلیل و تجزیے کا موضوع بن سکتے ہیں یا بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن سب سے اہم پہلو معاشرتی نفسیات کا ہے اور نفسیاتی مطالعے کے لئے خاصے کی چیز ہیں۔ لیکن اس سے کئی منفی اثرات مرتب ہو جائیں گے۔ مجموعی طور پر یہ ناول اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اردو فکشن کے کمیاب شاہکاروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اس کی زبان صحافتی اور غیر معیاری ہے۔ ناول نگار کی زبان دانی کے معاملے میں کھلنے والی کمزوریوں کی طرف اشارے کرتی ہے۔''

(اردو کے اٹھارہ ناول/محمد حامد علی خاں، ص ۱۹۸، مطبوعہ ۲۰۰۸ء)

''تلاشِ بہاراں'' کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ موضوع کے اعتبار سے جمیلہ ہاشمی کا یہ کوئی اہم کارنامہ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن

اس موضوع کو جس فنکارانہ چابکدستی اور خیال انگیزی کے ساتھ برتا گیا ہے، وہ نہ صرف اہم ہے بلکہ ناول اور ناول نگار دونوں کو انفرادو امتیاز خاص عطا کرتا ہے۔''

(اردو کے اٹھارہ ناول/محمد حامد علی خاں،ص ۵۰،مطبوعہ ۲۰۰۸ء)

درج بالا دونوں اقتباسات محمد حامد علی خاں کی تنقیدی حوصلہ مندی کا ثبوت ہیں۔ وہ اپنی بات کہنے کا نہ صرف سلیقہ رکھتے ہیں بلکہ تحریر اور موضوعات کی کمزوری کی نشاندہی کرنا اپنا فرض تسلیم کرتے ہیں۔ پہلے اقتباس میں محمد حامد صاحب نے ''راجہ گدھ'' (بانو قدسیہ) کی زبان اور اسلوب پر کھل کر بات کی ہے اور بانو قدسیہ کی زبان پر صحافتی اور غیر معیاری ہونے تک کی بات کردی ہے۔ یہی نہیں دوسرے اقتباس میں وہ جمیلہ ہاشمی کے ناول'' تلاش بہاراں'' کو بھی بڑا غیر معمولی اور یادگار ناول نہیں مانتے۔ لیکن جمیلہ ہاشمی کی پیش کش، فنکاری اور خیال انگیزی کی تعریف کرتے ہیں۔

محمد حامد علی خاں کی کتاب ''اردو کے اٹھارہ ناول'' کے تعلق سے درج ذیل کئی اہم نکات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

۱۔ محمد حامد علی خاں کی فکشن تنقید کا ایک مستحکم اور مستند حوالہ ''اردو کے اٹھارہ ناول'' ہے۔

۲۔ حامد علی خان اس کتاب کے علاوہ دیگر مضامین وکتب تحریر نہ کرتے، تو بھی فکشن تنقید کی روایت میں ایک اہم ناقد کے طور پر شمار ہوتے۔

۳۔ کتاب میں اٹھارہ ناولوں کا انتخاب اور ان کے تجزیے کے پیش نظر بی اے، ایم اے کے نصابات اور طلبہ وطالبات تھے۔

۴۔ طالب علموں کے نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

۵۔ کتاب کے تجزیوں میں محمد حامد علی خاں کا تنقیدی شعور اور تجزیاتی مزاج واضح ہوجاتا ہے۔

۶۔ اس کتاب کے ناولوں کا عہد تقسیم کے آس پاس سے اس صدی کے اواخر (1994) تک کا زمانہ ہے۔محمد حامد علی خاں نے کوشش کی ہے کہ اس عہد کے نمائندہ اہم ناولوں کو سمیٹ لیں۔

۷ محمد حامد علی خاں نے شعوری کوشش کی ہے کہ ان کی کتاب اسلوب احمد انصاری کی کتاب کا چربہ نہ پرتو لگے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اسلوب احمد انصاری کے انتخاب سے گریز کیا ہے۔ دو ایک ناولوں کو چھوڑ کر انہوں نے زیادہ تر اہم ناول منتخب کیے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دو ایک ناولوں کو چھوڑ دیا جائے تو محمد حامد علی خاں کا انتخاب جدید ناول کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ ہے۔

''اردو کے اٹھارہ ناول'' کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اسی سال اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی طمطراق سے شائع ہوا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف محمد حامد علی خاں کے تنقیدی رجحان اور شعور کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے بلکہ اردو ناول خصوصاً جدید اردو ناول کا ایک مکمل خاکہ ہمارے ذہنوں پر چسپاں ہوجاتا ہے۔

❑❑❑

محمد مجاہد سید
مہدی گنج، لکھنؤ-Mob.8601471591

غزل

کیا صرف لگ رہا ہے مجھے تیز دھوپ ہے
کوئی تو اور ہو جو کہے تیز دھوپ ہے

صحرائے پُر سراب کو بھی آ گیا ترس
اب کارواں یہاں سے اٹھے تیز دھوپ ہے

افراد جل رہے ہیں یہاں مثلِ چوبِ خشک
خیمے یہاں پہ کیوں ہیں گڑے تیز دھوپ ہے

اس دھوپ کے عذاب میں جب سب ہیں مبتلا
پھر کوئی کیوں کسی سے کہے تیز دھوپ ہے

کمھلا نہ جائیں پھول سے چہرے تپش سے اب
کوئی تو سائبان بنے تیز دھوپ ہے

یخ بستہ موسموں میں تو یہ سرد ہی رہا
اب جسم کا الاؤ جلے تیز دھوپ ہے

سب ہاڑ مانس جل چکے سیدؔ کے عشق میں
صحرا سے اب وہ دُور رہے تیز دھوپ ہے

●●●

ڈاکٹر معصومؔ شرقی
آر ایل بی لین، 24 پرگنہ، مغربی بنگال-Mob.9909328480

غزل

حسن عمل کو اپنے پرکھا کرتا ہوں
یوں اپنے قد کا اندازہ کرتا ہوں

کھو جاتا ہوں یادوں کے صحراؤں میں
خود کو جب بھی تنہا پایا کرتا ہوں

روز چھپا دیتی ہے اسے گردِ ماضی
روز نئی تصویر بنایا کرتا ہوں

کر کے نظر انداز میں حسن سیرت کو
اپنی صورت روز سنوارا کرتا ہوں

دنیا بھر کے منصوبے دل میں لے کر
چھوٹے سے کمرے میں گزارا کرتا ہوں

اپنی نظروں کو میں بنا کر آئینہ
خود اپنے عیبوں کو دیکھا کرتا ہوں

کم ظرفوں کی صحبت میں رہ کر معصومؔ
اپنے آپ کو کیوں میں رسوا کرتا ہوں

●●●

ڈاکٹر الیاس عزیز
اکبری گیٹ، لکھنؤ-Mob.8130646212

پروفیسر شارب ردولوی بحیثیت عملی تنقید نگار

شارب ردولوی اردو کے ترقی پسند نقاد تھے انہوں نے اپنی تصانیف میں نظریاتی اور عملی تنقید کے بڑے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں ان کی تصانیف ''جدید اردو تنقید اصول و نظریات''، ''تنقیدی مطالعہ''، ''تنقیدی مباحث'' اور مختلف تنقیدی مضامین میں شعراء و ادبا کے فن اور اصناف ادب پر ان کی عملی تنقیدیں ملتی ہیں۔ ان سب میں وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن اس تحریک کی شدت پسندی اور جذباتیت کا ان کے یہاں دخل نہیں ہے تنقید میں ان کا نظریہ وسیع تر ادبی و تہذیبی بنیادوں پر مبنی ہے۔

شارب ردولوی نے عملی تنقید کے میدان میں 1956، 1957 میں قدم رکھا اس وقت کے ان کے مضامین بہت اہم نہ ہونے کے باوجود ان کے یہاں تنقیدی توازن کی نشاندہی کرتے ہیں ان کی کتابوں میں پہلی کتاب ''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' ہے جو انہوں نے 1957 میں لکھی جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم-اے کے طالب علم تھے۔ یہ کتاب 1959 میں نسیم بک ڈپو لکھنو سے شائع ہوئی یہ کتاب شارب ردولوی کی عملی تنقید کے سلسلے میں اس لیے اہم ہے کہ اس میں مراثی انیس کے مطالعہ کے لیے بالکل نیا پہلو تلاش کیا گیا ہے۔ میر انیس پر اس وقت تک بہت کام ہو چکا تھا امداد امام اثر، شبلی نعمانی، مسعود حسن رضوی ادیب جیسے مرثیہ کے ماہرین کی کتابیں شائع ہو چکی تھیں لیکن یہ اتفاق ہے کہ اس وقت تک کسی نے مرثیہ کے ڈرامائی عناصر کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ شارب ردولوی نے مرثیہ کے مطالعے میں ایک نئے رخ کا اضافہ کیا انہوں نے خاص طور پر میر انیس کے مراثی میں مکالمہ، کردار نگاری، کشمکش Suspens اور تصادم Conflect کی نشاندہی کی ہے جو ڈرامہ کے عناصر ہیں اس طرح اپنی پہلی ہی کتاب کے ذریعے انہوں نے علماء کی نگاہ اور ادبی دنیا میں اپنی ایک جگہ بنالی۔

نقاد کی ایک خصوصیت غیر جانبداری بتائی جاتی ہے یعنی نقاد کو فن پارے کی تحسین و تنقیص میں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے اسی لیے شارب ردولوی کی تحریروں میں کسی طرح کی جانبداری نظر نہیں آتی وہ جب کسی فنکار یا فن پارہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو نہ حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں اور نہ حد سے زیادہ برائی بلکہ ان کا انداز معتدل و متوازن ہوتا ہے. فراق کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا انداز ملاحظہ ہو:

''فراق کو مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور آل احمد سرور کی طرح اس عہد کا ایک بڑا نقاد قرار دینا مشکل ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تنقیدی اہمیت کو یکسر نظر انداز کر دینا بھی ممکن نہیں ہے۔''

شارب ردولوی جس طرح فراق کی شاعرانہ اہمیت کو تسلیم کرتے تھے اسی طرح وہ مولانا سلیمان ندوی کو ایک وسیع ذہن کا حامل مفکر مانتے تھے اور تاثراتی تنقید میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے تھے لیکن بحیثیت مجموعی انہیں ایک کامیاب نقاد ماننے سے انکار کرتے تھے۔ انہوں نے بہت صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ:

''سید سلیمان ندوی کا شمار بنیادی طور پر اردو کے ناقدین میں کرنا خود ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی لیکن ان کے تنقیدی مضامین و مقدمات اردو میں تاثراتی تنقید کی ایک اچھی مثال ہیں۔''

مندرجہ بالا رائے سے شارب رودولوی کی اعتدال پسندی واضح ہے تنقید میں جہاں اختلاف کی گنجائش ہوتی وہاں وہ غیر جانبداری سے بے لاگ تنقید کرتے تھے اور جہاں اتفاق کرنے کا معاملہ ہو وہ پوری دیانت داری اور دلائل کے ذریعے فن پارے کی تحسین کرتے تھے فنکار اور فن کی قدروں کے تعین کے سلسلے میں وہ جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ تخلیق کے دونوں رخوں یعنی خامیوں اور خوبیوں کو معتدل نقطۂ نظر کے ساتھ اجاگر کر دیتے تھے۔

شارب ردولوی کے عملی تنقید کے جائزے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سماجیاتی تنقید پر ایک نظر ڈالی جائے تا کہ ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ سماجیاتی تنقید ادبی تخلیق اور تخلیق کار سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے اور اس زمانے کے سیاسی و سماجی حالات کی روشنی میں ان کی اہمیت کا پتہ لگاتی ہے سماجیاتی نقاد کا ایک مقصد ان محرکات اور حقائق تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے جن سے متاثر ہو کر فنکار نے اپنے خیالات کا اظہار اور حالات کی ترجمانی کی ہے۔ سماجیاتی تنقید جیسے جیسے مقبولیت حاصل کرتی گئی اس میں نئے نئے خیالات و نظریات جگہ پانے لگے اور اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ سماجیاتی نقاد جہاں ادیب کے ماحول، اس کے خاندانی حالات، اس کے عہد کے سماجی، سیاسی، تاریخی و تہذیبی حالات کو پیش نظر رکھتا ہے، وہیں ادبی تخلیقات میں فنی و جمالیاتی اقدار اور فن پارہ کے نفسیاتی محرکات کا پتہ لگانا بھی ناگزیر خیال کرتا ہے اس طرح سماجی تنقید میں ادب پارے کا مجموعی حیثیتوں سے مطالعہ کیا جانے لگا اور اس میں اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھا گیا اور اس معروضی انداز سے کیا جانے والا مطالعہ سائنٹفک تنقید کی بنیاد قرار پایا۔

اردو میں سماجی نظریات کی مقبولیت میں احتشام حسین کی تحریروں کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔ شارب ردولوی کی شخصیت اور تحریروں پر احتشام حسین کا نہ صرف گہرا اثر نظر آتا ہے بلکہ انہوں نے احتشام حسین کے نظریات کو وسعت دینے کی ممکنہ حد تک سعی کی ہے۔ شارب ردولوی کے تنقیدی مطالعے کی بنیاد تاریخی، تہذیبی اور سماجی قدروں پر ہے وہ کسی فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت اسے اس کے مجموعی پس منظر میں

دیکھتے ہیں اسی لیے ان کے تجزیے سائنسی ومعروضی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اپنے مطالعے میں وہ کہیں بھی تنگ نظری کا شکار نہیں نظر آتے۔ ان کی تنقید میں وسعت، ہمہ گیری اور متوازن نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اردو ادب کے باکمال شعراء وادبا پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اور عملی تنقید کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔ اردو کے کلاسیکی شعراء میر، غالب، اقبال، انیس، ولی، سودا کے علاوہ جدید شعرا میں جگر، حسرت، فیض، سردار جعفری، نیاز حیدر اور کیفی اعظمی کے علاوہ بہت سے شعراء اور ادباء اور ناقدین ادب اور اصناف ادب پر بھی ان کی تنقیدی تحریریں ملتی ہیں جن کے تعلق سے ان کے نظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔

''جدید اردو تنقید اصول ونظریات'' شارب ردولوی کی نظریاتی تنقید کا نہیں بلکہ عملی تنقید کا بھی بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس میں تنقیدی دبستانوں کے ذکر کے سلسلے میں جہاں اردو کے مختلف نقادوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کی تنقیدی اہمیت کے بارے میں بھی شارب ردولوی نے مدلل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یوں تو حالی سے لے کر جدید ترین تنقید نگاروں تک کے کارنامے زیر بحث آتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ مثالیں صرف اس لیے پیش ہیں کہ اردو کی عملی تنقید میں شارب ردولوی کے Contribution کا اندازہ ہو سکے انہوں نے مختلف تنقیدی دبستانوں کے تحت ناقدین کا ذکر کیا ہے۔ اول اردو میں اب تک اردو ناقدین کو دبستانوں کے تحت پرکھنے اور جانچنے کی سعی نہیں کی گئی تھی۔ شارب ردولوی نے پہلی بار یہ قدم اٹھایا اور اس تقسیم سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ یہ مشکل کام تھا کہ کس ناقد کو کس دبستان میں رکھا جائے لیکن انہوں نے اس کام کو بہتر طریقے پر انجام دینے کی کوشش کی۔ مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''مجنوں کی ابتدائی تنقیدوں میں تاثراتی رجحان ملتا ہے لیکن بنیادی طور پر انہیں تاثراتی نقاد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ کسی بھی تجزیے کے وقت وہ فنکار کے حالات زندگی اور سماجی پس منظر کو نظر انداز نہیں کرتے۔''

اسی طرح عبدالرحمٰن بجنوری کی تنقید نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے ان کے یہاں شدت پسندی کی نشاندہی کی ہے وہ اس طرح کی تنقید کو صحت مند تنقید ماننے سے انکار کرتے ہیں ان کے مطابق تنقید میں وسیع نظریہ کا ہونا لازمی وناگزیر ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''غالب پر لکھی جانے والی کتابوں میں ان کے مقدمہ ''محاسن کلام غالب'' کی بڑی اہمیت ہے ان کی کتاب کی ابتدا ہی انتہائی رومانیت کی ایک بہترین مثال ہے۔۔۔۔۔۔۔ان کا معیار تمام تر ذوقی اور وجدانی ہے ان کے یہاں سائنٹفک تنقید یا نقطۂ نگاہ نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا گہرا تاثر اور رومانیت ہے وہ ایسی اصطلاحات اور پرشکوہ الفاظ اور رنگین جملوں کا استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اصل موضوع کو بھول کر انہیں جملوں اور اصطلاحوں میں کھو جاتا ہے حالانکہ اگر ہم غور کریں تو اس طرح کی تنقید صحیح معنوں میں تنقید نہیں کہی جا سکتی یہ ایک طرح کا جذباتی ردعمل ہے جہاں نقاد اپنے تخیل سے ایک نئی کائنات بنا لیتا ہے۔''

شارب ردولوی نے خورشید الاسلام کو خاص تاثراتی

نقاد نہیں مانا بلکہ شارب نے فنکار کے عہد، اس کی شخصیت اور فن کا مطالعہ کیا اور ان عوامل کی نشاندہی کی جو سماجی تنقید کی خصوصیات ہیں وہ لکھتے ہیں:

''خورشید الاسلام اردو تنقید میں بڑا پر فریب اسلوب لے کر آئے پر فریب اس لیے کہ اس کو پڑھ کر ایک ساتھ کئی چیزوں کا احساس ہوتا ہے کبھی ان کے مضامین پر صرف انشائیہ کا شبہ ہوتا ہے کبھی تاثر کا پرتو گہرا ہو جاتا ہے کبھی تشریحی انداز نمایاں ہو جاتا ہے اور کبھی مادی، تاریخی، اور سماجی حقیقتوں کے پیش نظر ایک منفرد اور خوبصورت انداز میں کسی شہ پارے کے اقدار کے تعین کی کوشش معلوم ہوتی ہے ان کا اسلوب اردو تنقید میں منفرد ہے۔''

حسن عسکری کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تنقید میں تاثراتی ونفسیاتی رجحانات میں انتہا پسندانہ نظریات کی نشاندہی کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''حسن عسکری کی تنقیدوں میں دو رجحانات نمایاں طور پر ملتے ہیں ایک تاثراتی اور دوسرا نفسیاتی اس لیے ان کو دونوں رجحانات کی نمائندگی کرنے والے ناقدوں میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے یہاں دونوں رجحانات میں انتہا پسندی ہے وہ تنقید سے زیادہ رائے زنی کرتے ہیں وہ جس کے قائل نہیں ہیں یا جن باتوں کو مانتے نہیں ہیں اس کا ذکر کرتے وقت ان کے لہجے میں تحقیر کا انداز نمایاں ہو جاتا ہے جو کہ صحت مند تنقید کی علامت نہیں ہے۔''

شارب ردولوی نے جہاں حسن عسکری پر تنقید کرتے وقت ان کی انتہا پسندی اور شدت کو ناپسند کیا وہیں وہ ڈاکٹر مسیح الزماں کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے یہاں تاریخی تنقید کے ساتھ ان کی گہری بصیرت کی ستائش بھی کی ہے اور ان کی تنقید کو صحت مند نظریۂ تنقید سے تعبیر کیا ہے:

''اردو تنقید میں ڈاکٹر مسیح الزماں کو کافی اہمیت ہے وہ سب سے پہلے ہمارے سامنے تنقید کے ایک مورخ کی شکل میں آئے ہیں ان کے دوسرے ادبی وتنقیدی کارناموں میں بھی تاریخ کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ان کی کتابیں بے جان تاریخ یا ناموں اور سنوں کی فہرست نہیں بلکہ ایک صحت مند تنقیدی نظریے کے تحت ترتیب دی ہوئی تصانیف ہیں وہ دوسرے ترقی پسند ناقدین کی طرح ادب کے سماجی پہلو پر زور دیتے ہیں اور زبان و ادب کو زمانے اور ماحول کا پروردہ سمجھتے ہیں اور اس کے مطالعہ یا کسی ادبی فیصلے کے لیے ان محرکات کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔''

جن ناقدین نے فن پارہ کی تحسین صرف ایک پہلو یا ایک رخ سے کی ایسے مطالعہ کو شارب ردولوی صحیح نہیں مانتے انہوں نے ادیب وشعرا کی تخلیقات کا مطالعہ مجموعی حیثیت سے کیا ہے ان کے مطابق فن پارے کا یک رخا مطالعہ فنی قدروں کے تعین میں دشواری کا سبب بن سکتا ہے۔

سلیم احمد کی تنقید میں نفسیاتی رجحان نمایاں نظر آتا ہے شارب ردولوی نے سلیم احمد کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تنقید میں نفسیاتی عناصر کی نشاندہی کی اور ان کی تنقید کو رائے زنی، جملے بازی اور چونکا دینے والی تنقید قرار دیا ان کے مطابق سلیم احمد کی تنقید مجموعی حیثیت سے فنکار یا فن

پارہ کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کرتی صرف فنکار کی ذہنی الجھنوں پر روشنی ڈالتی ہے وہ لکھتے ہیں:

"وہ (سلیم احمد) صرف فرائیڈ اور تحلیل نفسی کی قدروں کو مانتے ہیں انہوں نے اردو شاعری میں صرف نچلے دھڑ کی تلاش کی ہے ان کی اس انتہا پسندی نے ان کی تنقید کو رائے زنی بنا دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ تحلیل نفسی یا "زیر دامن" تنقید میرا جی اور ن۔م راشد کے یہاں نچلے دھڑ کی اہمیت اور ان کے جنسی مریض ہونے پر تو روشنی ڈال سکتی ہے لیکن ان کے کلام کی مجموعی حیثیت یا قدر و قیمت کا تعین نہیں کر سکتی اس قسم کے مضامین خود اس کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ قدروں کے تعین کے لیے نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ ان کا مقصد رائے زنی، جملہ بازی کرنا اور چونکانا ہے۔"

شارب ردولوی نے جدید ناقدین کی تنقید نگاری پر بھی قلم اٹھایا ہے انہوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری سے بحث کرتے ہوئے اسلوبیات اور ساختیات پر ان کے کام کو سراہا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"...گوپی چند نارنگ نے میر انیس اور اقبال دونوں کے کلام کے تجزیے میں ان کی اثر انگیزی اور مقبولیت کو کھلے "قوافی"، قصیدے کی شوکت و بلند آہنگی غزلیہ لے صفیری و مسلسل اور طویل مصوتوں کے ربط و امتزاج اور اہمیت کے مقابلے میں فعلیت اور مصوتوں کی کثرت سے تعبیر کیا ہے لیکن انہوں نے اس بات سے بحث نہیں کی ہے کہ ایسا کیوں ہے شاید اس لیے کہ اسلوبیات یا ساختیات صرف موجود متن سے بحث کرتی ہے اس کے اسباب و علل سے نہیں اس میں شک نہیں کہ گوپی چند نارنگ نے اس رجحان (اسلوبیات) کو مقبول بنانے میں جس استدلال اور طریقے سے کام لیا ہے اس نے اسلوبیات اور ساختیات کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔"

عملی تنقید کی ایک خصوصیت تشریح و توضیح بھی ہے نقاد کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتے وقت اپنے نظریات کی نہ صرف تشریح کرتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ اس کی وضاحت کرتا جاتا ہے تاکہ قاری کو نقاد کے نظریات سمجھنے میں دشواری نہ ہو شارب ردولوی بھی نقاد کی اس خصوصیت کو ضروری قرار دیتے ہیں کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کی خامی پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

".. کلیم الدین احمد کی عملی تنقید میں بھی یہی خامی ہے کہ ہم کسی ایسے نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ نقاد کے بنیادی اصول تنقید کو سمجھ سکیں یا یہ جان سکیں کہ وہ دراصل کہنا کیا چاہتا ہے عملی تنقید کے مطالعہ سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی غزل میں کیا خرابیاں ہیں اور شعر میں کس بات کو کس طرح سے پیش کیا گیا ہے لیکن نقاد ان باتوں کا تجزیہ کر کے خود کس نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے یا قاری کو کس نتیجے پر پہنچانا چاہتا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا۔"

شارب ردولوی نے نظریاتی تنقید میں ادبی مطالعے کے جن اصولوں پر زور دیا ہے انہیں اصولوں کو انہوں نے اپنی عملی تنقید میں برتا ہے اس طرح ان کے مطالعے سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اصول کس حد تک کسی فنی تخلیق کی قدروں کے تعین میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

❑❑❑

فقیر محمد بےنوا قادری
سہسوان، بدایوں-Mob.8936926809

غزل

جب کسی بات پہ دیوانے مچل جاتے ہیں
خلوتِ حسن کے آئین بدل جاتے ہیں

اُن کے بکھرے ہوئے گیسو جو سنورتے ہیں کبھی
پیچ وخم اِس دلِ غمگیں کے نکلا جاتے ہیں

کھول دیتے ہیں مرے شوقِ نہاں کا پردہ
میرے آنسو سرِ مژگاں جو مچل جاتے ہیں

اُن کی تصویر انیس غم تنہائی ہے
ہم اسی سے شب فرقت میں بہل جاتے ہیں

حاکمِ وقت کی نیت میں اگر کھوٹ نہ ہو
خود بخود ملک کے حالات سنبھل جاتے ہیں

میرا دل ہے کہ نہیں جس میں کسی سے نفرت
پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو دیکھ کے جل جاتے ہیں

بےنوا جب بھی کوئی وقت برا آتا ہے
غیر تو غیر ہیں اپنے بھی بدل جاتے ہیں

●●●

عرفانؔ زنگی پوری
کاظمین روڈ، لکھنؤ-Mob.9721900506

غزل

اپنی پیشانی پہ لکھی ہوئی تحریر نہ دیکھ
عزم و ہمت کا تقاضا ہے کہ تقدیر نہ دیکھ

خشک آنکھوں کے جزیروں میں حسیں تاج محل
جاگتی آنکھوں سے اس خواب کی تعبیر نہ دیکھ

عکس آئینہ یہ کہتا ہے کہ اے عمر رواں
روز آئینے میں مٹتی ہوئی تصویر نہ دیکھ

حریت کہتی ہے اے قافلہ سالارِ وفا
پھول کانٹوں میں کھلا پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

زخم دل آنکھوں سے رِستا ہے لہو کی صورت
قلب احساس میں پیوست ہیں جو تیر نہ دیکھ

صرف اسلاف کے جوہر سے جو روشن تھا کبھی
عہد ماضی کا وہ آئینۂ توقیر نہ دیکھ

کون عرفانؔ ہے کس کی ہے حکایت تحریر
پڑھ لے آیاتِ جنوں اور کوئی تفسیر نہ دیکھ

●●●

ڈاکٹر محمد الیاس قاسمی تابؔ خیر آبادی
موبائل: 936944467

رباعی

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جو رباع سے بنا ہے رباع کے معنی ''چار چار'' اس لحاظ سے رباعی کے معنی ہوئے ''چار چار'' والی یعنی وہ مخصوص و مختصر شعری صنف جو چار چار مصرعوں پر مشتمل ہو۔اسی طرح اس کا دوسرا نام ''دوبیتی'' بھی اسی وجہ سے ہوا کیونکہ دو بیت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اصطلاح میں رباعی سے مراد وہ صنف سخن ہوتی ہے جو چار مصرعوں پر مشتمل ہو اور فکر و خیال کے لحاظ سے مکمل ہو۔

رباعی میں مصرع بہ مصرع خیال کا تسلسل اور ارتقا پایا جاتا ہے اور آخری مصرع میں یہی خیال اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے اسی لئے چوتھا مصرع زیادہ جامع اور زور دار بلکہ پوری رباعی کا خلاصہ ہوتا ہے اس کے اندر پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔

شمیم احمد رقم طراز ہیں:

''اردو کی اصناف سخن میں رباعی ایک چھوٹی سی لیکن اہم صنف ہے یہ عام طور پر فلسفیانہ، اخلاقی، تفکیری اور کبھی کبھی عشقیہ مضامین پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اس کا عام رنگ سادہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں Lyrical کہتے ہیں خطابیہ اور اصلاحی انداز سے عموماً گریز کرتی ہے۔''
(اصناف سخن اور شعری ہیئتیں ص۔۲۹۶)

رباعی کے آغاز سے متعلق اکثر تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ یہ ایران کی اختراع ہے اور رودکیؔ اس کا موجد ہے اس کا پورا نام ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن رودکیؔ بیٹھا ہوا تھا اور بچے کھیل رہے تھے یکا یک ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا گرا بچے کی زبان سے بے ساختہ نکلا ''غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گور'' بعد میں رودکی نے تین مصرع اور کہہ کے رباعی مکمل کی اور یہی بحر ہزج رباعی کا وزن قرار پائی۔

اردو میں پہلا رباعی گو شاعر قلی قطب شاہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔اس طرح فارسی اور اردو دونوں زبان کے شعرا کے یہاں نہ صرف یہ کہ رباعی کی اہمیت مسلم ہے بلکہ رباعی گوئی کی صحت مند اور شاندار روایت موجود ہے۔ فارسی میں ابوسعید ابوالخیر، ابوشکور بلخی، سعدی و جامی اور عمر خیام جیسے شہرۂ آفاق رباعی گو پیدا ہوئے۔

اردو میں انیس، جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھپوری جیسے نابغۂ روزگار اور قادر الکلام شعراء نے رباعی گوئی کی روایت کو مستحکم کیا اگر جوشؔ ملیح آبادی کی رباعیات کا مجموعہ ''قطرہ و قلزم'' ان کی شہرت و مقبولیت کا باعث بنا تو فراقؔ

گورکھپوری کو بھی رباعیات کے مجموعہ ''روپ'' نے بجا طور پر زندہ جاوید بنادیا۔

اس کے بعد ناوک حمزہ پوری، فضا ابن فیضی، امانت اللہ اسیر، رمز آفاقی جیسے فنکاروں نے رباعی گوئی میں اپنے فنی کمال اور شعری جمال سے مشاقی کے جوہر دکھائے۔

رباعی کی تخلیق میں ظاہری ہیئت کے اعتبار سے کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی بلکہ دیکھنے میں غزل کے دوشعر محسوس ہوتے ہیں البتہ اس کی اندرونی ہیئت جس کا تعلق عروض سے ہے وہی اس کی صنفی شناخت اور وجہ اختصاص ہے یعنی رباعی کے لئے ایک خاص بحر مختص ہے اور وہ بحر ہزج ہے۔ اس کے اوزان مخصوصہ میں ہی کہی جاسکتی ہے اور رباعی کا اپنے مخصوص وزن میں ہونا ہی اس کی اولین شرط ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے تیسرا مصرعہ ہم قافیہ نہیں ہوتا لیکن کبھی ہو بھی سکتا ہے ایسی صورت میں چاروں مصرع ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں جیسے میر کی یہ رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

ہجراں میں کیا سب نے کنارا آخر
اسباب گیا جینے کا سارا آخر
نے تاب رہی نہ صبر و یارا آخر
آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

تیسری شرط یہ ہے کہ چاروں مصرعوں میں مضمون ایک ہی ہو جس میں پہلے تین مصرعوں میں ذہن کو تیار کیا جائے اور آخری مصرعہ میں مطلب بیان کر دیا جائے میر انیس کی یہ رباعی دیکھیں۔

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

انیس کی اس رباعی میں تیسرے مصرعہ کے سوا باقی تینوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں۔ رباعی غیر مردف بھی ہوسکتی ہے۔

رباعی کا فن کافی مشکل خیال کیا جاتا ہے جو شاعر سے خون جگر کا تقاضہ کرتا ہے جب تک مدت العمر کی طویل مشاقی، اور فکر وخیال میں پختگی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ حیات وکائنات کے تلخ وترش تجربات و مشاہدات نہ ہوں رباعی کہنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ رباعی کے لئے صرف شعر گوئی پر قدرت اور مہارت کافی نہیں بلکہ عروض کی فنی باریکیوں سے خاطر خواہ واقفیت بھی لازمی ہے۔

بقول جوش ملیح آبادی:

''رباعی ایک بہت بڑی بلا اور جان لیوا صنف کلام ہے یہ کم بخت چالیس برس سے پیشتر بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں جب تک کسی شاعر کو بے پناہ مشاقی اور بے نہایت دیدہ وری کی بدولت دریا کو کوزے میں بھرنے کا کام نہیں آتا اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی۔ قلیل الفاظ کی وساطت سے کثیر معنی کا احاطہ کر کے صرف چار مصرعوں میں اس ربع مسکون کے تمام تجربات و مشاہدات، تاثرات، نظریات اور افکار کا سمیٹ لینا

ایک ننھے سے قطرہ میں قلزم کو مقید کر لینا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں۔'' (قطرہ و قلزم ص۔۱،۲)

رباعی کی اہم ترین خصوصیت اس کے مخصوص اوزان ہیں یہ اوزان بحر ہزج سے اخذ کئے گئے ہیں ۹ زحاف لگا کر ان اوزان کا استخراج کیا گیا ہے۔

(۱) خرم (۲) خرب (۳) قبض (۴) کف (۵) ہتم (۶) جب (۷) بتر (۸) شتر (۹) خرم+ہم (زلل)

زحافات کی تفصیل:۔ ماہرین عروض نے ان زحافات کو لگا کر رباعی کے ۲۴ اوزان برآمد کئے ہیں بارہ (۱۲) شجرۂ اخرب کے تحت جو مفعول سے شروع ہوتے ہیں اور بارہ (۱۲) شجرۂ اخرم کے تحت جو مفعولن سے شروع ہوتے ہیں۔

(۱) خرم:۔ جس رکن کے شروع میں وتد مجموع ہو اس وتد مجموع کے پہلے حرف کے گرانے کو کہتے ہیں یہاں مفاعیلن کے مفا سے 'میم' گرادی فاعیلن بچا اس کو مفعولن سے بدل دیا۔

(۲) اخرب:۔ زحاف خرم اور کف کے مجموعہ کو کہتے ہیں مفاعیلن سے خرم کے ذریعہ ''م'' گرائی اور کف کے ذریعہ مفاعیلن کا ساتواں حرف گرایا اس سے پہلے کی حرکت بدستور قائم رہی لہٰذا دونوں زحاف لگنے کے بعد فاعیل بچا اس کو مفعول سے بدل دیا۔

(۳) قبض:۔ پانچواں حرف گرانے کو کہتے ہیں مفاعیلن سے ''ی'' گرادی مفاعلن بچا۔

(۴) کف:۔ ساتویں حرف ساکن کو گرا کر اس سے پہلے حرف کی حرکت برقرار رکھنے کو کہتے ہیں مفاعیلن سے مفاعیل بچا۔

(۵) ہتم:۔ زحاف حذف اور زحاف قصر کے مجموعہ کو کہتے ہیں مفاعیلن سے حذف کے ذریعہ لن ہٹایا مفاعی بچا فعولن سے بدلا اس پر قصر لگا یا فعول لام ساکن کے ساتھ بچا یوں ہی رکھ دیا۔

(۶) زحاف جب:۔ مفاعیلن پر جس وقت یہ زحاف لگتا ہے تو آخر کے دونوں سبب خفیف گر پڑتے ہیں مفا بچتا ہے اسے فعَل سے بدل دیتے ہیں یہ رکن آخر میں آتا ہے۔

(۷) بتر:۔ جب اور خرم کے مجموعہ کو کہتے ہیں مفاعیلن سے جب کے ذریعہ عیلن گرایا مفا بچا اس پر خرم لگایا فا بچا اسے فع سے بدل دیا یہ رکن بھی آخر میں آتا ہے۔

(۸) اشتر:۔ قبض اور خرم کے مجموعہ کو کہتے ہیں مفاعیلن سے قبض کے ذریعہ یا تحتانی گرائی اور خرم کے ذریعہ ''م'' گرائی فاعلن باقی رہا۔

(۹) ہتم اور خرم:۔ مفاعیلن سے خرم کے ذریعہ ''لن'' پھر ''ی'' گرائی مفاع بچا خرم سے ''م'' گرادی فاع بچا یہ آخری رکن میں آتا ہے۔

ان مذکورہ بالا زحافات کی مدد سے برآمد کئے گئے ۲۴ اوزان میں سے کسی بھی وزن میں شاعر کو رباعی کہنے کی اجازت ہے بلکہ یہاں تک آزادی ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے چار مختلف اوزان میں کہے جا سکتے ہیں۔ مثال کے لئے مع تقطیع کے یہ رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

ہے تیز ہوا اور گھنی بارش بھی
دل ایک حویلی ہے بوسیدہ سی

بس ایک یہی شئے ہے ورثے میں ملی
رہ رہ کے مٹی جھڑی جائے اس کی

تقطیع:۔ ہے تیز ہوا اور گھنی بارش بھی
مفعول مفاعیل مفاعیلن فع

دل ایک حویلی ہے بوسیدہ سی
مفعول مفاعیلن مفعولن فع

بس ایک یہی شے ہے ورثیم ملی
مفعول مفاعیلن مفعول فعل

رہ رہ کے مٹی جھ ڑجائے اس کی
مفعولن مفعول مفاعیلن فع

اس رباعی کے چاروں مصرعوں میں چار مختلف اوزان استعمال کئے گئے ہیں اس سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امین فن حضرت امانت اللہ اسیؔر (مرحوم) نے پہلے تو ۲۴ اوزان میں ۲۴ رباعیاں کہیں جو ان کے شعری مجموعہ ''صدائے عرش گیر'' میں درج ہیں بعدہٗ ہر مصرعہ الگ وزن میں کہتے ہوئے ۲۴ اوزان پر مشتمل چھ رباعیاں تخلیق کیں جو فن عروض پر ان کی گرفت اور کامل دسترس کی دلیل ہونے کے ساتھ ان کے قادر الکلام شاعر ہونے کا بھی بین ثبوت ہے۔

(شجرۂ اخرب)

رباعی کے ۲۴ اوزان:۔

(۱) مفعول مفاعیل مفاعیل فعل
اخرب مکفوف مکفوف مجبوب

(۲) مفعول مفاعیل مفاعیل فعول
اخرب مکفوف مکفوف ہتم

(۳) مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
اخرب مکفوف سالم ابتر

(۴) مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع
اخرب مکفوف سالم اخرم/ہتم

(۵) مفعول مفاعیلن مفعول فعل
اخرب سالم اخرب مجبوب

(۶) مفعول مفاعیلن مفعول فعول
اخرب سالم اخرب ہتم

(۷) مفعول مفاعیلن معفولن فع
اخرب سالم اخرم ابتر

(۸) مفعول مفاعیلن معفولن فاع
اخرب سالم اخرم خرم/ہتم

(۹) مفعول مفاعلن مفاعیل فعل
اخرب مقبوض مکفوف مجبوب

(۱۰) مفعول مفاعلن مفاعیل فعول
اخرب مقبوض مکفوف ہتم

(۱۱) مفعول مفاعلن مفاعیلن فع
اخرب مقبوض سالم ابتر

(۱۲) مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع
اخرب مقبوض سالم خرم/ہتم

(شجرۂ اخرم)

(۱۳) مفعولن مفعول مفاعیل فعل

اخرم اخرب مکفوف مجبوب

(۱۴) مفعولن مفعول مفاعیل فعول

اخرم اخرب مکفوف ہتم

(۱۵) مفعولن مفعول مفاعیلن فع

اخرم اخرب سالم ابتر

(۱۶) مفعولن مفعول مفاعیلن فاع

اخرم اخرب سالم اخرم/ہتم

(۱۷) مفعولن مفعولن مفعول فعل

اخرم اخرم اخرب مجبوب

(۱۸) مفعولن مفعولن مفعول فعول

اخرم اخرم اخرب ہتم

(۱۹) مفعولن مفعولن مفعولن فع

اخرم اخرم اخرم ابتر

(۲۰) مفعولن مفعولن مفعولن فاع

اخرم اخرم اخرم اخرم/ہتم

(۲۱) مفعولن فاعلن مفاعیل فعل

اخرم اشتر مکفوف مجبوب

(۲۲) مفعولن فاعلن مفاعیل فعول

اخرم اشتر مکفوف ہتم

(۲۳) مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

اخرم اشتر سالم ابتر

(۲۴) مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

اخرم اشتر سالم اخرم/ہتم

رباعی کا موضوع:

قدیم زمانہ میں رباعی میں صرف حکیمانہ یا ناصحانہ موضوعات ہی بیان کئے جاتے تھےلیکن اب رباعی میں مختلف النوع اور ہمہ جہت مضامین وافکار نظم کئے جاتے ہیں خواہ ان کا تعلق فلسفہ واخلاق سے ہو یا پند وموعظت سے عشق وشباب کی باتیں ہوں یا ساقی وشراب کے قصے ان سبھی موضوعات کے لئے رباعی کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ چنانچہ عمر خیام نے جو فارسی کا سب سے بڑا رباعی گوشاعر تسلیم کیا جاتا ہے اپنی رباعیوں کو مے کشی اور عشق ومستی سے بھر دیا ہے۔ اس نے مے نوشی کے لئے ضابطہ بتایا ہے کی کب پینی چاہئے کس کے ساتھ پینی چاہئے اور کیسے پینی چاہئے۔

گر بادہ خوری تو با خرد منداں خور
یا با صنمی لالہ رخی خنداں خور
بسیار مخور ورد مکن فاش مساز
کم کم خور گہہ گہہ خور و پنہاں خور

اسی طرح اردو میں جوشؔ ملیح آبادی نے بھی حیات وکائنات کے مسائل وتجربات کے ساتھ ساتھ ساغر وشباب جیسے موضوعات کو اپنی رباعیات میں پیش کیا ہے ایک رباعی دیکھیں۔

کل رات گئے مست تھی جب بادِ نسیم
شبنم میں نہار ہی تھی پھولوں کی شمیم
اک روح نے ساغر میں اتر کر یہ کہا
میں روح بے ہوش رہا ہوں تسلیم

اس سے ثابت ہوا کہ رباعی کے لئے بھی غزل کی طرح کسی خاص موضوع یا فکر وخیال کی پابندی ضروری نہیں بس وحدت تاثر اور تسلسل خیال لازم ہے۔

❑❑❑

احمد کمال حشمی
کانکی نارہ، مغربی بنگال-Mob.9433145435

غزل

کسی کا اشک بہانہ بھی سانحہ ٹھہرا
ہمارا قتل بھی معمولی واقعہ ٹھہرا

اس ایک بوسۂ نم کو گزر گئے برسوں
مگر لبوں پہ ابھی تک ہے ذائقہ ٹھہرا

تمہاری یادوں سے مغلوب اب نہیں ہوں گے
دل و دماغ میں اب کے معاہدہ ٹھہرا

کبھی وہ متن، کبھی مرکزی خیال رہا
اور ایک میں کہ ہمیشہ ہی حاشیہ ٹھہرا

وہ میرے ساتھ نہیں ہے تو لگتا ہے کہ وہ ہے
مرا خسارہ ہی اب میرا فائدہ ٹھہرا

نتیجہ کچھ ہو مری جیت تو یقینی ہے
کہ آج مجھ سے مرا ہی مقابلہ ٹھہرا

کمالؔ اس نے جہاں میرا ساتھ چھوڑا تھا
میں چل رہا ہوں مگر ہے وہ راستہ ٹھہرا

●●●

معید رہبرؔ
سعادت گنج،لکھنؤ-Mob.9889371674

غزل

میں نے یوں تیری محبت کا بھرم رکھا ہے
سرِ تسلیم ترے حکم پہ خم رکھا ہے

حسرتِ دید لئے ہی نہ چلا جاؤں کہیں
اب تو آ جا کہ مری آنکھوں میں دم رکھا ہے

درد احساس کی شدت سے بڑھا ہے جب بھی
میں نے مرہم کی جگہ زخم پہ سم رکھا ہے

میں قلندر ہوں مجھے تجھ سے غرض کچھ بھی نہیں
مری ٹھوکر پہ ترا جاہ و حشم رکھا ہے

میری حق گوئی کا انعام یہی ہے شاید
اس نے مجھ پر جو روا ظلم و ستم رکھا ہے

اعتبار اس کو ہوا شہر ادب میں حاصل
میں نے جو لفظ سرِ نوکِ قلم رکھا ہے

دل کے میزان پہ مشکل ہے توازن رہبرؔ
کچھ زیادہ یہاں کچھ عشق نے کم رکھا ہے

●●●

ڈاکٹر محمد مستمر
اسسٹنٹ پروفیسر، ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی
Mob.8920860709

ادیبؔ سہارن پوری کم عمر کا بڑا فنکار

ادیبؔ سہارن پوری کا اصل نام عبدالرؤف تھا اور تخلص ادیب فرماتے تھے۔ان کا جنم 28 مئی 1920 کو سہارنپور میں ہوااور وفات 16/ جولائی 1963 کو پاکستان کے شہر کراچی میں ہوئی۔لیکن ''صوفی نامہ'' سائٹ پر ان کی پیدائش یکم مئی اور وفات یکم جولائی درج ہے جبکہ ولادت اور وفات کا سن ایک ہی ہے۔اس طرح سے دیکھا جائے تو ان کی عمر صرف 44 سال کچھ مہینے ہوتی ہے۔ ادیبؔ سہارن پوری کی زندگی کا زیادہ تر حصہ ریاست اندور مدھیہ پردیش میں گزرا۔ اندور میں وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کیا کرتے تھے۔اس کاروبار سے وہ مہینے میں اتنا کما لیا کرتے تھے کہ زندگی کی گزراوقات ہوجایا کرتی تھی۔ ریاست اندور سے وہ پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور کچھ دن تک روزی روٹی کے لیے کافی تگ وتاز کرتے رہے۔ بعد میں انہیں کیپٹن خالد جمیل کی سفارش پر پاکستان نیوی میں ملازمت مل گئی تھی۔ ادیبؔ سہارن پوری پرانی قدروں کے پاسدار تھے اور اپنی غزلوں کو ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ان کی آواز میں ایک طرح کا سحر تھا، کشش تھی اور لوگوں کو اپنی جانب اپنی آواز اور کلام کے باعث متوجہ کرلیا کرتے تھے۔جیسا کہ فوج کے محکمہ کا اصول ہے کہ سال میں ایک بار طبی معائنہ ہوتا ہے جب ادیبؔ سہارن پوری کا طبی معائنہ کیا گیا تو ان کے پھیپڑوں میں معمولی سی تکلیف بتائی گئی لیکن پھیپڑوں کا مرض بڑھتا گیا اور حالت نازک سے نازک ہوتی چلی گئی ۔آخر کار 16 /جولائی 1963 کو بہت قلیل عمر میں اردو کا یہ نوجوان سپاہی اس دنیا کو خیر آباد کہہ گیا۔ادیبؔ سہارن پوری کا تعلق ریڈیو پاکستان سے بھی رہا۔

ادیبؔ سہارن پوری کی زندگی تمام عمر زیادہ تر آلام و مصائب اور مشکلات سے دوچار ہوتی رہی۔ زندگی کے نشیب وفراز نے انہیں کبھی آرام کرنے نہیں دیا۔ادیبؔ سہارن پوری کا جو زمانہ ہے وہ ویسے تو ترقی پسندی کا زمانہ ہے مگر ان کے کلام کو پڑھنے پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی طور پر اس تحریک سے متاثر نہیں تھے۔ان کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خالص کلاسکی قدروں اور روایتوں کے امین ہیں۔ان کے کلام کا تغزل اور جمالیاتی حسن انہیں ان شعراء کی صف میں کھڑا کرتا ہے جس کا تعلق نئی غزل کے عناصرِ اربع یعنی فانی، اصغر اور جگر اور حسرت سے ہے۔ادیب سہارنپوری بہت کم عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ جب ان کی عمر محض 16/

برس کی تھی تو انہوں نے باقاعدہ پہلی غزل کہی تھی۔ اتنی کم عمری میں غزل کہنا اس لیے تعجب کی بات ہے کہ جب ہم ان کی پہلی غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو احساس نہیں ہوتا کہ یہ غزل ایک 16 برس کے عمر کے نوآموز سخن ور کی غزل ہے بلکہ جب اس غزل کو پڑھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ایک کہنہ مشق تجربہ کار اور عمر رسیدہ شاعر کی غزل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر اس غزل کو شامل کیا جائے جو 1936 میں انہوں نے سپردِ قلم کی تھی۔

آ کہ مجبورِ فغاں ہوں غمِ پنہاں کی قسم
خلشِ جاں کی قسم، دردِ فراواں کی قسم
آ ہی جاتا ہے مجھے عذرِ تغافل پہ یقیں
بھکی بھکی نگہ حسنِ پشیماں کی قسم
اب بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے شکلِ امید
عشق اور عشق کے افکارِ پریشاں کی قسم
اب بھی ہے دل کو ترے وعدۂ فردا کا یقیں
دردِ ہجراں کی قسم، شوقِ فراواں کی قسم
غمِ ہستی سے ہے لبریز مرا پیمانہ
فیضِ ساقی کی قسم، جرأتِ عصیاں کی قسم
جی رہا ہے کسی امید پہ بے چارہ ادیبؔ
جانِ راحت ترے بھولے ہوئے پیماں کی قسم

مذکورہ غزل کے اشعار، اس کی ردیف اور قافیہ کی بندش، چستی اور چابک دستی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ادیب سہارن پوری کا نقطۂ نگاہ، سوچنے کا نظریہ اور تجربہ کم عمری میں ہی کتنا عمیق اور مشاہدے سے بھرا ہوا تھا۔ بالکل بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ غزل ایک کم سن بچے کی غزل ہے۔ اس میں وہ ذہن رسا، تخیل کی پرواز اور توجہ و احساس و ادراک کا مثلث قائم ہے جو ایک پختہ فنکار کی دلیل ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ میں گلاب کی سی خوشبو، صندل کی مہک اور حنا کا رچاؤ موجود ہے۔ ایسا حنائی رچاؤ جو بار بار کی قرأت کے بعد مزید سرخ مائل ہوتا جاتا ہے اور نئے معنی کی حنائی خوشبو غزل میں مستعمل الفاظ کے بطن سے آتی رہتی ہے۔ کلام میں نفسیاتی گرہیں، پیچ و خم، کشمکش اور بے زاری کے عناصر اس طرح سانس لیتے ہیں کہ جیسے فنکار زندگی کے ایک طویل آلام و مصائب سے دوچار ہے۔ مذکورہ غزل ادیبؔ سہارن پوری کے شعری مجموعے رنگ و آہنگ میں شامل ہے جس کو پہلی غزل کے طور پر پہلے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ یہ مجموعہ سن 1951 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس مجموعے میں غزلیں نظمیں اور قطعات موجود ہیں۔ ہر تخلیق کے اختتام پر سنِ تخلیق درج ہے جس سے ادیبؔ سہارنپوری کے تخلیقی سفر اور بتدریج ارتقائے سخن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے قبل ہم ادیب سہارن پوری کے فن پر اپنی رائے کا اظہار کریں مجموعے میں شامل ان دانشوران کی آرا کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جنہوں نے موصوف کے کلام و شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

مشہور رومانی نقاد اور افسانہ نگار علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

"ادیبؔ کو میں نے اول اول شاعر ہونے ہی کی حیثیت سے جانا تھا۔ لیکن اب انسان ہونے کی حیثیت سے بھی ان کے مطالعے کا موقع ملا اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ادیب صرف شاعر ہی نہیں بلکہ

انسان بھی ہے۔حساس، غیور، خوددار اور حد درجہ مخلص و صادق۔لکھنؤ سے وہ اندور واپس گئے اور پھر چند دن کے بعد میرے ہی مشورے پر پاکستان چلے گئے۔ پاکستان میں ان پر کیا گزری مجھے نہیں معلوم۔لیکن اس قدر جانتا ہوں کہ وہاں زمانے نے ان کو اپنا کلام شائع کرنے کی فرصت دے دی۔جو شاید یہاں اس قدر جلد نصیب نہ ہوتی۔''

(مشمولہ: مجموعہ رنگ وآہنگ صفحہ:4-5)

مجموعے میں شامل علامہ نیاز فتح پوری کے تاثرات دو صفحے پر ہیں۔زیادہ تر بات انھوں نے ادیب سہارن پوری کے تعلق سے کی ہے اور کلام پر کم کم ہی روشنی ڈالی ہے۔بطور نمونہ کچھ اشعار پیش کر دیے ہیں، اس شرط کے ساتھ تاکہ قاری خود ان کی شاعری کا مطالعہ کرے اور ان کے کلام سے محظوظ ہو۔مذکورہ اقتباس میں جو بات علامہ نیاز فتح پوری نے ادیب سہارنپوری کی ذات اور کلام کے تعلق سے کہی ہے کہ وہ شاعر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں اور اچھے انسان بھی ایسے جس میں خودداری اور غیرت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔جب ہم ادیب سہارنپوری کے کلام کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو یہ امر سخن منکشف ہونے میں دیر نہیں لگتی کہ ادیب سہارنپوری کا کلام اور شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔وہ تمام زیریں اور داخلی لہریں موصوف کے کلام کا خاصہ اور عناصر ہیں جن کا ذکر بہ حیثیت انسان علامہ نیاز فتح پوری نے کیا ہے۔اس سے آگے رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی ان کے شعری محاسن اور شخصی پہلوؤں پر کچھ اس انداز سے رقم طراز ہیں:

''غزل کی نزاکتوں اور وسعتوں کا (جو دراصل براہ راست زندگی کی نزاکتیں اور وسعتیں ہیں) انہیں گہرا اور فنکارانہ احساس ہے۔ اگر چہ شعور اور پختگی اپنی ریاضی طلبی کی بنا پر ہمیشہ سے آہستہ خرام رہی ہے۔پھر بھی جس ترقی پذیر رفتار سے یہ ادیب کے کلام میں داخل ہوتی جارہی ہے وہ نہایت امید افزا ہے۔خوش گو ہونے کے باوجود انہوں نے خوش گوئی کو ہی سب کچھ نہیں سمجھا ہے۔تجرباتی شاعری انہیں خیال و بیان کے متنوع اور پر پیچ وادیوں میں کشاں کشاں لے گئی ہے اور لیے جارہی ہے۔ جہاں حسین خیال اور شوخ اندازِ بیان کے علاوہ غمِ دوراں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور یہی وہ نازک مرحلہ ہے جہاں شاعر کی شخصیت اور اس کے فن دونوں کو کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔''

(مشمولہ: مجموعہ رنگ وآہنگ صفحہ:7-6)

مذکورہ بالا اقتباس میں رئیس المتغزلین جگر مراد آبادی نے جو بات ادیب سہارن پوری کے تعلق سے کہی ہے کہ وہ صرف ایک خوش گو شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی تجرباتی شاعری انہیں خیال و بیان کے متنوع اور پر پیچ وادیوں میں کشاں کشاں لے گئی ہے اور لیے جارہی ہے۔یہ نکتہ بہت اہم ہے اور جس پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔جگر مراد آبادی نے ان کی شاعری کے تعلق سے جو باتیں مختصر طور پر بیان کی ہیں، وہ حقیقتاً ادیب سہارن پوری کے فن کی روشنی میں کی گئی ہیں۔اس سے آگے وہ غمِ دوراں کی بات کرتے ہیں کہ اس وصف کی جھلکیاں بھی ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ادیب سہارن پوری کے کلام کا جب ہم گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں تو یہ اوصاف ان کی شاعری میں جنم لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں وہ ایک اچھے، خوش فکر اور جمالیاتی قدروں کے شاعر ہیں تو وہیں ان کے کلام میں وہ فنی پہلو اور زاویے بھی جنم لیتے ہیں جن کا تعلق غمِ دوراں سے ہے۔خوشی اور

غم کا امتزاج یہ زندگی کا اہم پہلو ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان کو فقط مسرت اور شادمانی ہی میسر ہو۔ درحقیقت زندگی کی معنویت اور وسعت کا اندازہ تب ہی ہوتا ہے جب انسانی زندگی میں نشاط انگیزیوں کے ساتھ الم کی کیفیتیں بھی جنم لیتی ہیں۔ خوشی کی قدر و قیمت کا اسی وقت پتہ چلتا ہے کہ جب ہم آلام و مصائب، پریشانیوں اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ جگر مرادآبادی کے ساتھ ہی ممتاز حسن احسنؔ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''ادیب سہارنپوری نے اپنے مجموعۂ کلام کو رنگ و آہنگ کا نام دیا ہے مگر یہ عنوان ادیبؔ کی شاعری کا پورے طور سے احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو ادب کے شعر و نغمہ سے لبریز فضا میں ادیب کی شاعری ایک نئے رنگ کی مظہر اور ان کا نغمہ ایک نئے آہنگ کا حامل ہے۔ مگر ان کے ہاں اس رنگ و آہنگ کے علاوہ بلکہ ان سے ماورا بھی بہت کچھ ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہی ان کی شاعری کی جان ہے۔''
>
> (مشمولہ: مجموعہ رنگ و آہنگ صفحہ:9)

> ''ادیب کی فلسفیانہ شاعری بھی ایک نیا انداز لیے ہوئے ہے۔ ان کی نظر کائنات کے انفرادی مظاہر سے گزر کر زندگی کی مجموعیت پر مرکوز ہوگئی ہے۔ زندگی ایک قافلہ ہے جو مسلسل چلا جا رہا ہے اور ادیب اسی قافلے کی راہ پیمائیوں کے تماشائی ہیں۔''
>
> (مشمولہ: مجموعہ رنگ و آہنگ صفحہ:13)

اصل میں ممتاز حسن نے جس رنگ و آہنگ کی بات کہی ہے انہوں نے ان دونوں لفظوں سے محدود مراد لے لی ہے جبکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی نظر میں رنگ و آہنگ فقط اس پہلو یا چیز کا نام ہے جس میں صرف نغمہ اور سرود کی بات کی جاتی ہے۔ جہاں تک راقم کی فکر کا تعلق ہے اس کے نزدیک رنگ سے مراد وہ تمام رنگ شامل ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی اور کائنات سے وابستہ ہے۔ اسی طریقے سے لفظِ آہنگ بھی بہ معنی وہ تمام آوازیں، شور اور طوفان سے تعلق رکھتا ہے جو ایک معجون کی شکل میں ہمارے اعصاب دماغی نظام شعور اور لاشعور کے نہاں خانوں میں ہلچل مچاتا رہتا ہے۔ یہ وہی آہنگ ہے جو شاعر کو بے چین کرتا ہے اس بات پر کہ تم اپنی چشم بینا اور چشم ظاہر سے جو کچھ بھی دیکھ رہے ہو اس کو ایک اثر انگیزی اور سحر انگیزی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر مرتسم کردو۔ ممتاز حسن نے معلوم نہیں کیا سوچ کر رنگ و آہنگ ترکیب کی معنویت کو محدود کر دیا ہے۔ انہی کے ساتھ اردو کے مشہور انشائیہ نگار اور نقاد رشید احمد صدیقی ادیبؔ سہارن پوری کی شاعری کے تعلق سے یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''ادیب سہارنپوری کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد فی الفور اگر یہ رائے قائم کر لی جائے کہ آئندہ وہ شاعری کی عظمتوں پر فائز ہو جائیں گے تو یہ کچھ نجومیوں کی سی بات ہوگی۔ لیکن ایک بات ماننی پڑے گی کہ وہ سمجھدار آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو دونوں گروہوں سے نکال کر ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یعنی وہ ایک انسان ہیں۔ اس لیے ان تمام جذبات کو پیش کرتے ہیں جو انسانوں کے جذبات ہیں۔ دوسری طرف وہ فنکار ہیں۔ اس لیے ان جذبات کو فن کے پردے پر لانے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔''
>
> (مشمولہ: مجموعہ رنگ و آہنگ صفحہ: ج)

مذکورہ اقتباس میں رشید احمد صدیقی کی یہ بات قابلِ غور ہے کہ ادیبؔ سہارنپوری کو انسانوں کے جذبات کو فن کے پردے پر لانے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ درحقیقت اصل سخنوری یا فنکاری وہی ہوتی ہے کہ فنکار انسانی جذبات، خیالات، احساسات اور حادثات کو کتنے خوبصورت طریقے سے انہیں فن کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ جہاں تک راقم کا ماننا ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر انسانوں کے جذبات اور احساسات قریب قریب ایک جیسے ہی ہیں۔ اگر فرق ہے تو خیالات اور نظریات کا ہے لیکن شاعری کی جو اساس مانی جاتی ہے وہ بالخصوص جذبات و احساسات پر مبنی ہوتی ہے۔ خیالات اور نظریات ہمیشہ بدلتے رہیں گے اور زمانے کے مطابق حادثات و مسائل بھی نئے جنم لیتے رہیں گے مگر جذبات اور احساسات ہمیشہ یکساں ہیں اور یکساں رہیں گے۔ کسی بھی ملک کا رہنے والا انسان ہو، کوئی بھی زبان یا بولی بولتا ہو مگر اس کے دلی جذبات اور احساسات سب جگہ برابر ہوں گے۔ فنکار کا کمال یہی ہے کہ وہ ہر دور میں نئے مسائل اور موضوعات کو بنیاد بنا کر انسانی جذبات اور احساسات کو اپنے اسلوب اور طرز نگارش سے کتنے مؤثر اور جامع انداز میں پیش کرتا ہے اور فنکار کی انفرادیت نیز اس کا تشخص بھی اسی میں مخفی ہوتا ہے۔ ادیبؔ سہارنپوری کے سامنے بھی اپنے دور کے مسائل اور موضوعات تھے جن کو انہوں نے اپنے طور پر محسوس کیا اور پھر اپنی فنکارانہ توانائی کے ساتھ شعری سانچوں میں ڈھال دیا۔

ادیبؔ سہارن پوری ہوں یا پھر اور کوئی فنکار یا پھر میرؔ کی بات ہو یا غالبؔ کی بات ہو یا پھر اقبال کی بات۔ آج ان تمام شعراء کی جو انفرادیت ہے وہ اسی بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے چیزوں کو اور انسانی جذبات اور احساسات کو اپنے طور سے محسوس کیا اور پھر اپنے ڈھنگ اور طریقے سے انہیں شاعری کے سانچے میں ڈھال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میرؔ کی آواز اپنی آواز ہے۔ غالبؔ کا اپنا رنگ و آہنگ ہے اور اقبال کی اپنی روش ہے۔ ہر ایک فنکار اپنی روش، اپنے ڈھنگ اور اپنے آہنگ کی وجہ سے ہی انفرادیت حاصل کرتا ہے جس میں الفاظ کا انتخاب کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ یہ الفاظ کا ہی جادو اور طاقت ہے کہ جہاں غالبؔ، اقبال اور فیض احمد فیض جیسے لوگ نئے اسلوب کو جنم دیتے ہیں۔ ادیبؔ سہارن پوری کی کائناتِ غزل کو پڑھنے کے بعد یہ احساس بخوبی ہوتا ہے کہ انہوں نے پرانے پیانوں میں نئی شراب کشید کرنے اور بھرنے کی کوشش کی ہے۔

ادیبؔ سہارن پوری کا شعری مجموعہ اگست 1951 میں بہ اہتمام نصیر کرمانی، منظر عام پر آیا تھا۔ اس مجموعے پر یہ بات بھی تحریر ہے ''منتخب غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سے الگ بھی غزلیں اور نظمیں ضرور کہی ہوں گی مگر موصوف کے نزدیک جو غزلیں اور نظمیں پسندیدہ رہی ہوں گی انہوں نے اس مجموعے میں شامل کر دیا۔ اس سے آگے ایک اور امر جو تحقیق طلب ہے کہ ادیبؔ سہارن پوری کا انتقال 1966 میں ہوا یعنی یہ مجموعہ 15/ سال پہلے شائع ہو چکا تھا۔ ظاہر سی بات ہے اس درمیان بھی ادیب سہارن پوری کے رشحاتِ قلم سے بے شمار گوہر نایاب اُگلے ہوں گے مگر اس کے علاوہ کوئی مجموعہ ان کا دستیاب نہیں ہوتا۔ اس مجموعے کا انتساب ان کے بہت عزیز دوست کیپٹن خالد جمیل کے نام ہے۔ یہ وہی خالد جمیل ہیں جن کے توسل سے ادیبؔ سہارنپوری کو پاکستان نیوی آرمی میں

ملازمت ملی تھی۔ سب سے خاص بات اس مجموعے کی یہ ہے کہ ادیبؔ سہارنپوری نے ہر غزل پر سنِ تخلیق درج کیا ہے۔ اس تاریخ کے درج ہونے سے ان کے تخلیقی نشیب وفراز اور شاعری کے تعلق سے روز بروز جو تغیرات اور تبدیلیاں موصوف میں رونما ہوئیں ان کا علم ہوتا ہے۔

ادیبؔ سہارن پوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر انہوں نے نظمیں بھی سپرد قلم کی ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی وہی رنگینی، وہی شگفتگی، وہی جمالیاتی حس، وہی تغزل دیکھنے کو ملتا ہے جو ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ان کی پہلی غزل کے تعلق سے اوپر بھی عرض کیا ہے کہ ان کی پہلی غزل کو پڑھ کر ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک منجھے ہوئے فنکار تھے۔ ان کی فکر کے دریچے، زاویے اور پہلو کم درجے کے نہیں تھے بلکہ ان کی پروازِ تخیل، الفاظ کا انتخاب اور تراکیب کی بندش سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل کو بہت گہرائی میں ڈوب کر سمجھا تھا۔ غزل کن فنی تقاضوں کا مطالبہ اور تقاضا کرتی ہے۔ ان کے کلام کی روشنی میں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ان تقاضوں اور مطالبوں سے بخوبی واقف تھے۔ ادیبؔ سہارن پوری کو زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی قادر الکلامی کے اوصاف ان کی غزلوں میں موجزن ہیں۔ لفظوں کی چاشنی، مصرعوں کی دروبست، ردیف اور قافیہ کا آہنگ اور موضوع کا تنوع انہیں قاری کے قریب کر دیتا ہے۔ وہ بڑی بحروں میں بھی غزلیں کہتے ہیں اور چھوٹی بحر میں بھی بڑی معنی خیز گفتگو کرتے ہیں اور اس معنویت میں ان کے فکر کی وسعت اور ابعادِ ثلاثہ کا فن صاف دکھائی دیتا ہے۔

نغماتِ غم، جہانِ غم، غمِ فراق، کثرتِ غم، زہرِ غم، غمِ اضطراب، عہدِ غم، نشترِ غم، متاعِ غم، وفورِ غم وغیرہ ایسی بے شمار تراکیب ادیبؔ سہارنپوری کی غزلوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو انہوں نے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو ایک جگہ جمع کر کے دوآتشہ کا کام کر دیا ہے۔ ان کی غمگین کیفیت اور دلی افسردگی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فانیؔ کے زیادہ قریب آ گئے ہیں اور کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے بقول میر ''دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے'' کے مصداق نظر آتے ہیں۔ چند شعر یہاں بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

اک جاوداں خلش کی تمنا ہے اے ادیبؔ
وہ اضطراب ہو کہ غمِ اضطراب ہو

متاعِ غم کی نگہباں ہے اب بھی میری وفا
ذرا تو اپنی جفاؤں سے پوچھ کیا ہوں میں

اس طرح کر رہا ہوں گوارا غمِ فراق
جیسے خوشی سے زہر پیے جا رہا ہوں میں

دیکھے ہیں میں نے کون و مکاں کانپتے ہوئے
تو بھی وفورِ غم میں کبھی گنگنا کے دیکھ

مزید ادیبؔ سہارنپوری کے فلسفۂ غم کو سمجھنے کے لیے 'رنگ و آہنگ' شعری مجموعے سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ ان کی غزلوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ انہوں نے غم کو اور غموں کے تھپیڑوں کو بہت قریب سے سمجھا اور جھیلا ہے۔ غم کا ایک عجیب طوفان جوان کی شاعری میں پایا جاتا ہے اس سے قاری کے اعصابی نظام اور قشری لختوں میں بھی ایک عجیب قسم کی ہلچل اور ذہن و دماغ میں مایوسی، قنوطیت اور بیزاری کی کیفیت جنم لینی

شروع کر دیتی ہے اور یہی بیزاری قاری کو ادیبؔ سہارنپوری کے فن اور شخصیت کے اور قریب لے آتی ہے۔ بات چاہے ادیبؔ سہارنپوری کی ہو یا پھر دوسرے شاعر کی جہاں تک انسان کی تحلیلِ نفسی کا تعلق اس کی اساس بنیادی طور پر ایک سے ہی اصولوں پر قائم رہتی ہے۔ اس کا ماحول، اس کا معاشرہ، اس کی خانگی زندگی اور اس کے روزگار کے مسائل سے اس کی نفسیات جنم لیتی ہے۔ اور پھر انہی مسائل اور معاشرے کے تناظر میں وہ اپنے تخلیقی فن پاروں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ادیبؔ سہارن پوری جن حالات ومشکلات اور آلام ومصائب سے دوچار ہوئے اور زندگی کی تگ و تاز میں جو انہوں نے سرد وگرم ہواؤں کا احساس کیا ان کو اپنی شاعری میں اپنے قوتِ مشاہدہ احساس و ادراک اور فنکارانہ صلاحیت نیز باریک بینی اور تجربات کی بنیاد پر پیش کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فنکار اپنے عہد کا مؤرخ بھی ہوتا ہے اور ترجمان بھی۔ وہ اپنے ماحول سماج، معاشرہ اور سیاسی منظرنامے سے چشم پوشی اور پنبہ بگوش نہیں ہوسکتا۔ ادیبؔ سہارنپوری کی شاعری میں ہمیں وہ تمام آوازیں سنائی دیتی ہیں جو ان کے عہد کا حصہ رہی ہیں۔

ادیبؔ سہارن پوری کی غزلوں کی بساط معمولی نہیں ہے بلکہ ان کی غزلوں کے رنگ وآہنگ، ترکیب، محاورہ بندی اور الفاظ کی شیرینی سے وہ کائنات خلق ہوتی ہے جو غزل کا امتیاز اور تخصص مانا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں سوز وگداز کی کیفیت، رنج وغم کا احساس اور آہ وفغاں کی لہریں کبھی واضح اور کبھی مبہم سنی جاسکتی ہیں۔ ادیبؔ سہارنپوری کے شعری لہجے کی گرماہٹ، شگفتگی، البیلا پن، سرمستی اور متن کے بطن میں پائے جانے والے غموں کے وہ پیکر جن میں ناامیدی ہوتے ہوئے کہیں نہ کہیں ایک جرأت، حوصلہ اور شاعر کی دلیری نظر آتی ہے، وہ قاری کو غزل کے نئے پیمانوں اور میخانوں سے روشناس کراتی ہے۔ ادیبؔ سہارنپوری کے لہجے اور شعری آہنگ میں ایک ایسا رچاؤ ہے، ایک ایسا جذبہ کارفرما ہے، ایک ایسی رقت انگیزی ہے، ایک ایسا عرفان اور گیان کا سمندر ہے جو غزل کو نئی معنویت اور انفرادیت عطا کرتا ہے۔ مثلاً وہ غم کے درمیانی لہجے میں اس نوعیت کے شعر خلق کرتے ہیں۔

اہلِ سخن کو شعر کے پردے میں اے ادیبؔ
پیغامِ انقلاب دیے جا رہا ہوں میں

ادیب سہارنپوری کی غزلوں کی روشنی میں یہ بات وثوق اور پورے اطمینان کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ادیبؔ سہارنپوری اپنے وقت کے ایک عمدہ فنکار تھے اور اپنے معاصرین شعراء میں ان کی اپنی الگ شناخت تھی۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے نہیں چلے بلکہ انہوں نے شاعری کے میدان میں ایک الگ نہج کا انتخاب کیا اور اپنی شاعری میں ایسی تشبیہات، استعارات، علامات اور تمثیلات استعمال کیں کہ جو حالانکہ تھیں تو وہ قدیم ہی مگر اپنی فنکارانہ صلاحیت اور باریک بینی اور شعوری بصیرت سے ان میں نئے رنگ بھرنے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ انہی رنگوں کے درمیان ایک نیا آہنگ اور ایک نئی آواز بھی پیدا کی۔ جس میں ان کی اپنی آواز، اپنی شخصیت شامل تھی اور سب سے بڑھ کر ان کے اپنی زندگی کے ذاتی رنگ شامل ہیں۔ ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے شعری مجموعہ 'رنگ وآہنگ' کے علاوہ ان کے دوسرے کلام کی بھی تلاش وتحقیق کی جائے تاکہ ادیبؔ سہارن پوری کو ان کے کلام کی روشنی میں اور مزید سمجھنے کے مواقع فراہم ہوسکیں۔

❑❑❑

محمد فہد پاشا
گارڈین ریچ، کولکاتا-Mob.9804228315

غزل

در گزر یوں خطا کرے کوئی
میرے حق میں دعا کرے کوئی

پھر بھی دل تک پہنچ ہی جاتا ہوں
لاکھ مجھ سے چھپا کرے کوئی

دل کے صحرا میں میری لیلیٰ ہے
خاک بن کر اُڑا کرے کوئی

آئینہ کی طرح صداقت ہے
جھوٹ کو سچ کہا کرے کوئی

میرے شعروں میں ذکر خار کا ہے
تبصرہ پھول کا کرے کوئی

اس کو عادت ہے حق بیانی کی
اجتناب اس سے کیا کرے کوئی

فہدؔ عہد وفا نبھاتے ہو
لاکھ تم سے دغا کرے کوئی

●●●

ڈاکٹر حشیم فاروقی
ہلور، سدھارتھ نگر-Mob.9919226121

غزل

سمٹ کے رہ گیا سارا جہان مٹی تک
بڑے بڑوں کی ہے آخر اُڑان مٹی تک

بہت غرور تھا زر اور بادشاہت پر
پہنچ گئے نہ سکندر مہان، مٹی تک

مرا پیام ہے سوداگروں سے نفرت کے
فقط رہیں گے یہ تیر و کمان مٹی تک

ترے کیئے ہوئے اعمال ساتھ جائیں گے
یہ عالی شان، چمکتے مکان مٹی تک

بنے ہوئے ہیں اسی سے، اسی میں ملنا ہے
وہ شیخ ہوں، کہ برہمن، پٹھان مٹی تک

سب اپنے وقت مقرر پہ جا پہنچتے ہیں
کبھی بزرگ، کبھی نوجوان مٹی تک

حشیم رب کو منا لو کہ جانے والے ہیں
تمہارا جسم، تمہارا گمان مٹی تک

●●●

اشفاق برادر

بابو پوروہ، کانپور-Mob.7499646978

مبارکباد

میں کیا سوچ رہا ہوں؟ یہی نا کہ میرے پاؤں اتنی جلدی تھک کیوں جاتے ہیں؟ کیا مجھ میں کمزوری اپنا قبضہ جما رہی ہے یا واقعی میں تھک چکا ہوں........

کچھ دن پہلے کی ہی تو بات ہے جب میں دوڑتا ہوا ڈاکٹر لیسین صدیقی کے مطب آیا اور ہانپتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب جلدی چلیں میرے والد صاحب چکرا کر گر پڑے ہیں اور بول نہیں رہے ہیں۔

پھر جو ہوا بس آنسوؤں بھری داستان، یا اللہ میرے والد کی مغفرت فرما اور ہم لوگوں کو صبر لیکن صبر، ایک پل میں میرا سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ میری ماں بیوہ ہو گئی، میں اور میری دو بہنوں کے سر سے محبت وشفقت بھرا سایہ رخصت ہو گیا۔ کم عمری کا عالم مت پوچھو کیا۔ کیا ظلم وستم حصے میں آئے؟

چھت بڑی مشکل سے بچی اس دور میں بھی کچھ لوگ ہیں جو سچ بولتے ہیں حقوق کی باتیں کرتے ہیں بڑے جگرے والے ہیں کاروبار تو سب ہی لے لیا گیا ہاں چند سکۂ رائج الوقت ضرور ملے، میرے والد کاروباری انسان تھے لکڑی کا کام کرتے تھے اپنے دونوں بھائیوں کو ساتھ رکھے ہوئے تھے بھائی ہونے کے ناطے ان پر پورا بھروسہ بھی کرتے تھے کبھی خرچ کے معاملے میں روکا ٹوکا نہیں۔

میری ماں نے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی لیکن سوائے سننے کے اور کوئی اثر نہیں ہوا۔ میری ماں نے کہنا ہی چھوڑ دیا اور جوڑ توڑ کر کے کچھ پیسے ضرور اکٹھے کرنے شروع کر دئے مگر میرے چھوٹے چچا کو ایک دن لوٹ لیا گیا جب وہ آٹھ لاکھ روپے لے کر سردار انکل کے پاس جا رہے تھے، سردار انکل لکڑی کے بہت بڑے تاجر تھے، میرے والد کو جب اس حادثے کی خبر ہوئی تو ان کو صدمہ ہوا خیر جیسے تیسے کر کے انہوں نے سردار انکل کی بقایا رقم ادا کر دی، میری ماں کے تمام پیسے اور گہنے ختم ہو گئے، میری والدہ نے اپنے بھائی کو کچھ نہیں کہا۔ ہاں، چلو جان تو بچ گئی روپے پھر کما لیں گے مگر یہ صرف خواب ہی تھا۔

میں اور میری ماں، دو بہنوں پر جیسے جہنم کا دروازہ کھل گیا ہو مگر ہمارے چچا لوگ مسکرا رہے تھے ان کے پاس دنیا بھر کے آرام تھے اور ہم پریشان، از حد پریشان تھے، وقت بدلے گا ضرور بدلے گا مگر کب؟ ایک آس تھی، ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع اپنے دائرے میں کتنی روشنی کی مالک ہوسکتی ہے، خواب اور خیالوں کے درمیان شب وروز گزر رہے تھے۔

میری ماں بڑے حوصلے والی تھیں، خود میدان میں نکل آئیں، سردار انکل نے مدد کی، خدا ان کا بھلا کرے، ایک ملازم بھی وفادار نکلا، لکڑی کے کاروبار کے معاملات بتانے لگا کافی جدوجہد کے بعد کاروبار نے رینگنا شروع کر دیا۔ اب میں نوجوانی کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ ماں مجھ کو حساب کتاب بتانے لگیں، میرے ذہن میں تو باتوں کا ایک انبوہ تھا ہی بڑے انہماک سے کاروبار کو دیکھنے بھالنے لگا۔

مگر میں اپنے ذہن سے بیتے ہوئے دنوں کی تلخ باتوں کو نکال نہیں سکا۔ جتنا سوچتا، اُتنا ہی غصہ آتا اور میں طرح۔طرح کے پلان بناتا کہ کس طرح اپنے اوپر کئے گئے ظلم وستم کا بدلہ لیا جائے، میری راتوں کی نیند اُڑ چکی تھی اس کے اثرات بھی مجھ پر نمایاں ہونے لگے تھے، چڑ چڑا پن، دن میں اونگھنا میری والدہ نے محسوس کرنا شروع کیا اور خاموش نگاہیں مجھ سے اکثر سوال کیا کرتیں کہ بیٹے تجھے یہ کیا ہو رہا ہے، ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے، انتقام کے فضول سے قدم تجھے ایک نیا جہنم عطا کر دیں گے، تیری منزل پہلے کاروبار میں چار چاند لگانا ہے، انتقام تجھے تیری منزل سے بھٹکا دے گا ظالموں کے لیے یہی سزا ہوگی کہ تو کاروبار میں وسعت پیدا کر دے یہ دیکھ دیکھ کر خود ہی جلتے رہیں گے۔

میرے جوان خون میں ایک شعلہ اٹھتا رہتا کہ تو برباد کر دے ان سبھی کو جو تیرے قصوروار ہیں مگر میں ماں کی نگاہوں کو جان چکا تھا کہ ایک دن ماں نے بہنوں کے سامنے ہی جب میں چائے پی رہا تھا کہا، بیٹا میں تیرے درد کو خوب سمجھ رہی ہوں مگر تو اپنا ذہن کاروبار میں لگا فضول باتوں میں اپنا قیمتی وقت مت برباد کر۔ جی ماں۔ میں بڑی مشکل سے بول سکا۔ میں نے دیکھا کہ ماں کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے یہ دیکھ کر میری بہنیں ماں ماں کہنے لگیں۔ ماحول میں افسردگی چھائی ہوئی محسوس کر میں نے اپنی والدہ کو مخاطب کیا۔ ماں، میں بھی ایک انسان ہوں، میں جذبات کی روانی میں بہک سکتا ہوں۔ مجھے معاف کرنا، میں اب بدلہ لینے کی کبھی نہیں کوشش کروں گا۔

میری ماں اور دونوں بہنوں نے ایک ساتھ زور سے کہا۔ آمین اور مجھے دوسرے ہی پل ایسا محسوس ہوا کہ جیسے زمین و آسمان نے مجھے مبارکباد دی ہو۔

❑❑❑

اردو اکادمی میں عالمی یوم اردو کا انعقاد

اتر پردیش اردو اکادمی میں علامہ اقبالؒ کی یوم پیدائش اور عالمی یوم اردو کے موقع پر ۹؍نومبر کو بھارتی بھاشا اتسو کے تحت علامہ اقبال لیکچر اور غزل گائیکی کے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پرنسپل سکریٹری ڈاکٹر ہری اوم (آئی.اے.ایس) شریک ہوئے۔ اس موقع پر پروفیسر عباس رضا نیر نے علامہ اقبال پر اپنا لیکچر پیش کیا۔ انہوں نے ترانۂ ہندی کی تشریح عام فہم زبان میں کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبالؒ نے پیار و محبت اور لب و رخسار کی شاعری نہیں کی بلکہ حیات و کائنات کے اسرار و رموز کو موضوع سخن بنایا فلسفۂ خودی اور شاہین ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ پروفیسر نیر نے کہا کہ علامہ اقبالؒ کے فلسفے کو سمجھنے کے لئے ان کا گہرائی سے مطالعہ ضروری ہے۔

ڈاکٹر ہری اوم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو کی روایت کو نسل در نسل پہنچائیں تا کہ اس جشن اردو کا مقصد پورا ہو۔ زمین، زبان اور تہذیب وراثت سے حاصل ہوتی ہیں، اگر یہ اچھی نہیں ہوں گی تو آنے والی نسل اچھی نہیں ہوگی۔ انہوں نے کمپیوٹر کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہارڈ ویئر بہت اچھا ہے اور سافٹ ویئر درست نہیں ہے تو کمپیوٹر بیکار ہے۔

اس موقع پر اکادمی کے سکریٹری شوکت علی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تمام سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ لکھنؤ کی مشہور گلوکارہ ڈاکٹر پربھا شریواستو نے علامہ اقبال کے کلام کے ساتھ دیگر شعراء کا کلام ساز اور آواز پر پیش کیا۔

نظامت کے فرائض اکادمی کے سابق سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر فرقان علی مخمورؔ کاکوروی نے انجام دئے اور اردو کے حوالے سے چند قطعات بھی پیش کئے۔

U.P. Urdu Akademi

Khabarnama

उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा

اُتر پردیش اُردو اکادمی خبرنامہ

Vol. No. 52 December 2023 Issue No. 6

عالمی یوم اردو کے موقع پر ۹ رنومبر ۲۰۲۳ء کو اردو اکادمی آڈیٹوریم میں ساز اور آواز پر
علامہ اقبال اور دیگر شاعروں کا کلام پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر پربھا شریواستو اور ہمنوا

عالمی یوم اردو کے موقع پر ۹ رنومبر ۲۰۲۳ء کو اردو اکادمی آڈیٹوریم میں سامعین کا ایک منظر